بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پندرہ روزہ تعمیرِ حیات لکھنؤ

ISSN 2582-4619

جلد نمبر ۶۲ | ۱۰/اکتوبر ۲۰۲۵ء مطابق ۱۷/ربیع الثانی ۱۴۴۷ھ | شمارہ نمبر ۲۳

اس شمارے میں

تمہاری یاد سے ہوتا ہے دل......	مولانا محمد عامر عثمانیؒ	۴
یہ نور ہمیشہ چمکا ہے، یہ نور ہمیشہ چمکے گا	محمد عمیر الصدیق ندوی	۵
صدارتی خطاب فقہی سمینار	حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی	۷
نبی اکرمؐ کی آخری وصیت	عبدالرشید راجستھانی ندوی	۹
سوال و جواب	مفتی محمد ظفر عالم ندوی	۱۰
مولانا مسعود علی ندویؒ	شاہ اجمل فاروق ندوی	۱۱
جنگِ آزادی کے چند اہم واقعات	ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی	۱۳
جذباتیت کے نقصانات	مولانا محمد خالد غازیپوری ندوی	۱۶
دنیا کے مختلف ازم اور اسلام	انیس احمد ندوی	۱۸
مایوسی-ایک خطرناک مرض	ڈاکٹر عبید الرحمٰن ندوی	۲۱
نسلوں کی جدید تقسیم اور......	مطیع الرحمٰن عوف ندوی	۲۲
اسلام نے دنیا کو نیا شعور دیا	محمد ناصر ندوی	۲۴
نبی رحمتؐ کی ہمدردی و غمگساری	محمد زاہد حسین ندوی	۲۶
زبان کا درست استعمال	محمد جاوید اختر ندوی	۲۷
بدھ مذہب-حقائق و معارف	طلحہ نعمت ندوی	۲۸
اسلام میں پاپائیت نہیں!	محمد نفیس خان ندوی	۳۰
تجاویز ساتواں فقہی سمینار	مجلس تحقیقات شرعیہ	۳۲

سرپرست

حضرت مولانا سیّد بلال عبدالحی حسنی ندوی

(ناظمِ ندوۃ العلماء لکھنؤ)

مدیر مسئول

شمس الحق ندوی

نائب مدیر

محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی

معاون مدیر

محمد اصطفاء الحسن کاندھلوی ندوی

محمد نفیس خان ندوی ❀ محمد جاوید اختر ندوی

مجلس مشاورت

مولانا عبدالعزیز بھٹکلی ندوی ❀ مولانا محمد خالد غازیپوری ندوی

قارئین محترم! تعمیرِ حیات کا سالانہ زرِ تعاون ذیل میں دیے گئے اکاؤنٹ میں جمع کرائیں!

TAMEER E HAYAT

A/c. No. 10863759868 (Current A/c.)

IFSC Code : SBIN0000125 -- Swift Code : SBINNB157

State Bank of India, Main Branch, Lucknow

براہِ کرم رقم جمع ہوجانے کے بعد دفتر کے فون نمبر یا ای میل پر خریداری نمبر کے ساتھ اطلاع ضرور دیدیں۔

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ

TAMEER–E–HAYAT

Tagore Marg, Badshah Bagh, Lucknow - 226007, Ph.:0522-2740406

website : http://tameerehayat.com - email : tameer1963@gmail.com

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

سالانہ زرتعاون -/500	فی شمارہ -/25	ایشیائی، یورپی، افریقی و امریکی ممالک کے لئے۔ $100

ڈرافٹ منیجر تعمیر حیات کے نام سے بنائیں اور دفتر تعمیر حیات ندوۃ العلماء لکھنؤ کے پتہ پر روانہ کریں۔ چیک سے بھیجی جانے والی رقم صرف All CBS Payable Multicity Cheques روانہ فرمائیں، بصورت دیگر ₹30/= جوڑ کر چیک دیں۔ براہ کرم اس کا خیال رکھیں۔

آپ کی خریداری نمبر کے نیچے اگر سرخ لکیر ہے تو سمجھیں کہ آپ کا زرتعاون ختم ہو چکا ہے، لہٰذا جلد ہی زرتعاون ارسال کریں۔ اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں، موبائل یا فون نمبر اور پتے کے ساتھ پن کوڈ بھی لکھیں۔ (منیجر تعمیر حیات)

پرنٹر پبلشر محمد طٰہٰ اطہر نے آزاد پرنٹنگ پریس، نظیر آباد، لکھنؤ سے طبع کرا کے دفتر تعمیر حیات مجلس صحافت و نشریات ٹیگور مارگ، بادشاہ باغ لکھنؤ سے شائع کیا۔

شعروادب

تمہاری یاد سے ہوتا ہے دل جواں اب بھی

مولانا عامر عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

تمہاری نعت کے قربان جان و دل لیکن — تمہاری نعت کے قابل کہاں زبان و قلم
قلم کی نوک پہ الفاظ تو بہت ہیں مگر — ثبوتِ صدقِ معانی کریں کہاں سے بہم
چڑھی ہوئی ہیں زباں پر کثافتوں کی تہیں
پھر اس زبان سے کیسے تمہاری نعت کہیں

بس ایک رسم ہے جس کو نباہنے کے لیے — تکلفات سے بزمِ سخن سجائی ہے
ہمارا شعر کہاں، دولتِ خلوص کہاں — سخن فروش ہیں، دادِ ہنر کمائی ہے
نہ سوز و ساز ہے دل میں، نہ آنکھ میں آنسو
کھلے ہوئے ہیں عقیدت کے پھول بے خوشبو

زباں پہ دعوائے مہر و وفا بہت کچھ ہے — سجی ہوئی ہے درود و سلام کی محفل
مگر دلوں میں غمِ آخرت کا نام نہیں — غمِ حیات کی چوکھٹ پہ سجدہ ریز ہیں دل
جمی ہوئی ہیں نگاہیں نشاطِ حاضر پر
نہ باز پرس کا خطرہ، نہ احتساب کا ڈر

وہ تم کہ شکرِ سراپا تھے اپنے رب کے لیے — یہ ہم کہ شکر گزاری سے واسطہ ہی نہیں
وہ تم کہ حق کے لیے سربکف تھے میداں میں — یہ ہم کہ زخم کے کھانے کا حوصلہ ہی نہیں
تمہیں عزیز تھی ہر شے عزتِ اسلام
ہمارے پاس فقط رہ گیا خدا کا نام

بتانِ قوم و وطن جن کو تم نے توڑا تھا — نئے سرے سے انھیں ہم نے پھر تراش لیا
کیا تھا تم نے اخوت کا جو محل تعمیر — اسے نفاق کی ضربت سے ہم نے توڑ دیا
ہماری ظلمتِ شب میں کہیں بھی نور نہیں
طلوعِ صبح کے آثار دور دور نہیں

ہمیں تمہاری غلامی پہ فخر ہے لیکن — بھلا دیا کہ غلامی کا مدعا کیا ہے
وفا کو ایک تخیل بنالیا ہم نے — ہمیں شعور نہیں مقصدِ وفا کیا ہے
طلب تصورِ منزل سے ہوچکی محروم
خود اپنی سمتِ سفر بھی ہمیں نہیں معلوم

حضور! پھر بھی یہ اشعار پیشِ خدمت ہیں — اگرچہ ہدیۂ ناچیز، کم عیار سہی
برائے نام سی نسبت تو تم سے باقی ہے — ہزار دامن ایمان تار تار سہی
تمہارا نام ہے تسکین روح و جاں اب بھی
تمہاری یاد سے ہوتا ہے دل جواں اب بھی

اداریہ

یہ نور ہمیشہ چمکا ہے، یہ نور ہمیشہ چمکے گا

محمد عمیر الصدیق ندوی

بیٹھے بیٹھے والی آسی مرحوم کے ایک شعر کا ایک مصرع یاد آ گیا۔ پہلے مصرع میں کچھ اس طرح کی بات تھی کہ دل کا نگر کبھی آباد تھا لیکن اب خاک سی اڑتی رہتی ہے۔ دوسرے مصرع میں بات پوری ہوگئی کہ:

اے غم دوراں! تیرے بہانے کیسے زمانے یاد آئے

عمر کا آخری پڑاؤ جب سامنے ہو تو گزرے ہوئے لمحات ہوں یا اور پہلے کے واقعات پھر سے ان کو دیکھنے یا یاد کرنے میں کچھ زیادہ ہی دل کو سکون اور قرار ملنے کی آس ہو جاتی ہے۔

بس اسی جذبے نے ان دنوں کو تلاش کرنے کی چاہت پیدا کر دی، جب ندوۃ العلماء کو علماء کے حلقے سے اٹھنے والی اصلاح کی آواز کا نام دیا گیا تھا۔ کیا وقت رہا ہوگا جب تمام ملک جو پہلے سے اس جیسی آواز کے لیے ہمہ تن انتظار تھا، وہ لبیک کی صداؤں سے گونج گیا۔ اس لبیک کے مخاطب وہ چند علماء تھے، جو بقول علامہ شبلی ابتدا میں مختصر تھے لیکن ان کی صداؤں کی بازگشت عجب انداز سے ملک کے کونے کونے میں گونجی۔ بتایا گیا کہ اس گونج کا دائرہ اتنا وسیع تھا کہ وہ بھی جو ندوہ کی حقیقت کو ذرہ برابر بھی نہیں سمجھتے تھے، یہ دیکھ کر کہ مسجد نشینوں کی ریاست قائم ہو رہی ہے، ایک دلچسپ ترین تعبیر کے مطابق وہ ہر طرف سے ٹوٹ پڑے اور دو ہی تین سال کے اندر اندر اس سرے سے اس سرے تک ہر طرف ندوہ ہی ندوہ کی صدا بلند ہوگئی۔

اسلامی ہند کی تاریخ میں یہ تحریک اپنی نوعیت کے لحاظ سے انفرادیت کے ساتھ اولیت کے مرتبے پر اگر فائز ہوئی تو ظاہر ہے کچھ وجہیں تھیں۔ ممکن ہے انیسویں صدی کے اواخر کے جیسے حالات سے پانچ سو سال کے زمانہ میں مسلم معاشرہ کا سابقہ نہ ہوا ہو، مایوسی، محرومی، شکست خوردگی، سپر اندازی، پسماندگی اور سب سے بڑھ کر مرعوبیت کے سیاہ بادل پہلے کبھی اس طرح چھائے بھی نہیں ہوں گے۔ اس لیے جو باتیں پہلے حاشیہ خیال میں نہیں آسکتی تھیں، اب وہی کرنے کے کام میں شامل ہوگئیں۔ ندوے کے بزرگوں نے بار بار یاد دلایا کہ اب کھوئی ہوئی عظمت کو حاصل کرنے کے لیے یہی کام ہے جو مستقبل میں کام آنے والا ہے۔

قریب سوا سو سال پہلے ندوہ جیسے حجر اسود کو اپنے مقام پر رکھنے والی وہ چادر ہو گیا، جس کو ملت کے ہر ہاتھ کا سہارا حاصل تھا۔ سب کی خواہشیں اس بات پر متفق ہوگئیں کہ اب وقت آ گیا ہے کہ علماء میں ایثار نفس کی خوبی پھر سے زندہ ہو، علماء، عصری تقاضوں سے واقف ہونے والوں کی صف میں نظر آئیں اور اس میں ان کا مقام نمایاں ہو۔ علماء ایسے ہوں جو اپنے ماحول کے مزاج شناس ہوں، تقریر اور تحریر کے میدانوں کو باشعور علماء کی قلت کا شکوہ نہ رہے۔ یہی نہیں ندوہ والوں نے آنے والے دور کی بین الاقوامیت والی جھلک دیکھ کر کرنے کا ایک کام یہ بھی بتا دیا کہ ندوہ ایسے علماء کا مخزن بنے جو ہندوستان سے باہر بھی اسلام کے پیغام کو پہنچانے اور عام کرنے والے ہوں۔

ندوہ کے ماضی کو اگر اسلام کے ماضی کی روشنی میں دیکھنے کی توفیق ہو تو پھر سمجھ میں آتا ہے کہ جب جب قوم کے سامنے ندوہ کے کسی عمل کی شکل ظاہر ہوئی، تو دیکھنے والے کی زبان اس کے دل کی ترجمان بن گئی۔ مثال کے طور پر جب رسالہ ''الندوہ'' کا دوسری بار ۱۹۴۰ء میں اجرا ہوا تو ایک صاحب نے مولانا سید سلیمان ندوی کو خط میں لکھا کہ:

''الندوہ کے عمل اجرا پر نہ صرف ندوہ کے مقاصد حیات کا احیاء ہوگا بلکہ آپ کی نگرانی میں علوم اسلامیہ کی نشر و اشاعت کا بھی ذریعہ ہوگا۔ یہ حقیقت ہے کہ آپ کی قیمتی زندگی کا ایک ایک لمحہ اسلام کی سربلندی اور احیائے علوم اسلامیہ کے لیے وقف ہے۔ حقیقی مضمون نویسی، ندوہ کے متعلقین اور فارغ التحصیل طلبہ کی امتیازی خصوصیت ہے''۔

یہ پورا خط بار بار پڑھنے کے لائق ہے۔ یہاں اس کے چند جملوں کو نقل کرنے کی وجہ حال ہی میں ندوہ میں تصنیف و تالیف کی نئی بہاروں کی لذت آشنائی کا ایک نہایت خوشگوار احساس ہے۔

چند مہینے پہلے عربی زبان میں ڈاکٹر محمد فرمان ندوی کی کتاب ''الشيخ سعيد الأعظمي الندوي: حياته وآثاره'' آئی جو مولانا ڈاکٹر سعید الرحمن اعظمی ندوی کی خدمات کا مستند مرقع ہے۔ پھر مولانا محمد نعمان الدین ندوی کے خوبصورت عربی اسلوب نگاری سے مرصع ''أعلام من ندوة العلماء'' نگاہوں کی زینت بنی، مولانا محمد علاؤالدین رانچوی ندوی کے قلم سے قاضی عیاض کی ''الشفاء'' کا اردو ترجمہ ''کتابِ شفا دَر حقوقِ مصطفیٰ'' ایسا ہوا جو اپنی خوبصورت نثر سے ترجمہ ہی نہیں رہا، طبع زاد ہو گیا۔ اسی طرح مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی کا مجموعۂ تقاریر ''خطباتِ محمود'' مرتبہ مولانا محمد سلمان بجنوری ندوی اور مولانا محمد فیضان نگرامی ندوی کی مرتبہ کتاب ''ذکرِ مبارک'' سے قلم کی خوشبوؤں میں اضافہ ہوگیا۔ ندوے سے خاندانی انتساب رکھنے والے ڈاکٹر عمار انیس نگرامی نے مولانا محمد اویس نگرامیؒ ندوی کے دادا مولانا محمد ادریس نگرامیؒ کی نایاب کتاب ''تذکرہ علمائے حال'' چھپوا کر بجا طور پر ندوہ ہی کے احاطۂ علمی کو رسم اجرا کے لیے منتخب کیا۔ ان تحریری کاوشوں میں ندوہ کی مجلس تحقیقات شرعیہ کی جدید کتابوں کا ذکر تو الگ سے اور تفصیل سے کیے جانے کی ضرورت ہے۔ مجلس کی تازہ ترین اشاعتوں نے ندوہ کے مقاصد میں شامل زمانہ کے فقہی مقتضیات اور مسائل و مشکلات کو سمجھنے اور سمجھانے کی ضرورت کو جس حسن و خوبی سے پورا کیا ہے، وہ بانیانِ ندوہ کی روح کی شادمانی کی بشارت ہے۔ ''تعمیر حیات''، ''البعث الاسلامی''، ''الرائد''، ''کاروانِ ادب'' کے مبارک علمی کارواں میں سہ ماہی ''تحقیقات شرعیہ'' کی شمولیت اور اشاعت بتاتی ہے کہ ندوہ زندہ ہے اور یہ زندگی اشاعت اسلام اور مدافعت اسلام جیسے مقاصد کے لیے اور بھی پائیدار ہوتی جائے گی، ان شاء اللہ!

قارئین کرام! ابھی (مورخہ ۱۴ / ربیع الثانی ۱۴۴۷ھ مطابق ۷ / اکتوبر ۲۰۲۵ء کو) ہم ندوہ کی سأت و تاسیس اور اس کی شہرت و مقبولیت کے ساتھ حال ہی میں اس کے چند علمی و ادبی اور تحقیقی و تصنیفی کارناموں کا ذکر خیر کر کے فارغ ہی ہوئے تھے کہ ایک اندوہناک خبر ندوہ ہی کے حوالہ سے موصول ہوئی، کہ اس کے ایک قابل و ہونہار فرزند مولانا ڈاکٹر نذیر احمد ندوی صاحب استاذ کلیۃ اللغۃ العربیۃ وآدابھا، اب ہمارے درمیان نہیں رہے۔ یہ خبر صاعقہ اثر ثابت ہوئی، جس نے دل و دماغ کو جھنجھوڑ ڈالا۔

مولانا مرحوم تواضع و انکساری، حلم و بردباری، بے نفسی و عاجزی و دیگر اعلیٰ اخلاقی صفات سے متصف اور نہایت نیک طینت و صالح شخصیت کے حامل تھے، تقریباً چار دہائیوں کا تربیتی و تدریسی دور انھوں نے ایک ماہر فن استاذ اور مخلص و مشفق مربی کا رول نبھاتے ہوئے گذارا، اس کے علاوہ وہ بہترین مترجم و انشاء پرداز بھی تھے، جن کو کئی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ ان کا رخصت ہوجانا دانش گاہ ندوۃ العلماء کے لیے قحط الرجال کے اس دور میں ناقابل تلافی نقصان ہے۔

قضاء و قدر پر ایمان رکھتے ہوئے ہم دعا گو و خواستگار دعا ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت کے آغوش میں جگہ دے، ان کی خدمات و اعمال کا بہتر صلہ دے، خویش و اقارب کو صبر جمیل سے نوازے، اور ندوہ کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے، آمین۔

بصیرت افروز

صدارتی خطاب

حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی

بمناسبت: دوروزہ فقہی سیمینار (۲۷-۲۸ ستمبر) = زیر اہتمام: مجلس تحقیقات شرعیہ، ندوۃ العلماء لکھنو

ضبط وپیشکش: محمد عامر ندوی (باحث مجلس تحقیقات شرعیہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ الحمد للہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین و خاتم النبیین سیدنا و نبینا و مولانا محمد وعلی آلہ وصحبہ أجمعین و علی من تبع بإحسان ودعا بدعوتھم الی یوم الدین، أما بعد۔ فأعوذ باللہ من الشیطان الرجیم، ھو الذي بعث في الأمیین رسولاً منھم یتلو علیھم آیاته و یزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمة، صدق اللہ العظیم۔

حضرات علماء کرام: مجلس تحقیقات شرعیہ کا یہ دو روزہ فقہی سیمینار ہے، یہ بات ہم سبھی جانتے ہیں کہ آج اس کی بہت زیادہ ضرورت ہے، الحمدللہ اللہ کا شکر ہے ملک میں مختلف ادارے اور اکیڈمیاں ہیں جو اس ضرورت کو پورا کر رہی ہیں، یہ حقیقت ہے کہ زمانہ ہمیشہ تغیر پذیر رہا ہے، لیکن ابھی جس تیز رفتاری کے ساتھ حالات بدل رہے ہیں اور نئی نئی ایجادات ہمارے سامنے آرہی ہیں وہ بڑی طلاطم خیز ہیں، ان حالات میں پورے ثبات اور استقامت کے ساتھ اپنی بنیادوں اور اصولوں پر قائم رہتے ہوئے ہمیں دین کی صحیح تصویر لوگوں کے سامنے پیش کرنی، اور پیش آنے والے نئے مسائل اور جدید چیلنجز کا شریعت کی روشنی میں حل پیش کرنا ہے، اگر خدانخواستہ یہ کام نہیں ہوا، تو ہم تحفظ دین کا عمل صحیح طور پر انجام نہیں دے سکیں گے، پھر آدمی اپنی سمجھ سے رائے پیش کرے گا، جو دل میں آئے گا وہ بولے گا اور اس پر عمل کرے گا اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دین انتشار کا شکار ہو جائے گا اور شریعت اسلامیہ کے اجزاء بکھر کر رہ جائیں گے۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے دین و شریعت کی حفاظت کی ذمہ داری کا وعدہ فرمایا ہے، قرآن مجید کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ”انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون“، اور یہ آخری دین و آخری شریعت ہے، جسے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں، یہ قیامت تک زندہ رہے گا۔ لیکن اصل مسئلہ ہمارا ہے کہ اگر ہم نے زمانہ کے چیلنجز کو نہیں سمجھا اور ان کا مقابلہ نہیں کیا، تو ہم خطرے میں پڑ جائیں گے۔

اللہ تعالیٰ تو اپنے دین کا کام کسی سے بھی لے سکتا ہے اور کسی بھی قوم کو اس کام کے لیے کھڑا کر سکتا ہے، لیکن ہم قافلے سے بہت پیچھے رہ جائیں گے اور ہو سکتا ہے کہ ہم ایسے دلدل میں پھنس جائیں جہاں سے نکلنا مشکل ہو جائے، اس لیے یہ جو غور و فکر اور بحث و تحقیق کا کام ہو رہا ہے، وہ بہت اہم ہے اور یہ دور اول سے جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سی روایات میں وارد ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر دور میں ایسے افراد کو پیدا کرے گا جو تجدید دین کا کام کریں گے اور اس دین کو آنے والی نسلوں تک منتقل کریں گے:

” یحمل ھذا الدین من کل خلف عدوله، ینفون عنه تحریف الغالین وانتحال المبطلین وتاویل الجاھلین“۔

(بیھقي ۱۰/۳۵۳ حدیث ۲۰۹۱۲)

بڑی صراحت کے ساتھ یہ بات آئی، ہمیں امید ہے کہ یہ سلسلہ چلتا رہے گا اور ہم تحفظ دین کی خاطر اس دین کو آنے والی نسلوں تک منتقل کریں گے، لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہماری کوشش جاری رہے اور ہم مکمل تگ و دو اور استقامت کے ساتھ یہ کام انجام دیتے رہیں، یہ جو یہ ادارے قائم ہیں، ان کا یہی مقصد ہے کہ ہم کوشش کرتے رہیں اور ہمارا قافلہ بچھڑنے نہ پائے۔

آج حالات بہت بدل چکے ہیں، دنیا کی لگام مغرب کے ہاتھ میں ہے، وہ جس طرف چاہتے ہیں اسے موڑ دیتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے جو دین ہم کو عطا فرمایا ہے وہ بہت مضبوط اور پائیدار ہے، اس کے اندر تمام چیزوں کا حل موجود ہے، بس ہمیں اس کی تہہ تک پہنچ کر اسے تلاش کرنا ہے

اور اس کی گہرائی میں جا کر ان جواہر کو ڈھونڈنا ہے جن سے جدید مسائل کا حل ممکن ہو، یہ کام ہمارے فقہاء اور علماء کا ہے اور الحمدللہ وہ بحسن وخوبی اس کام کو انجام دے رہے ہیں اور آج جو سیمینار چل رہا ہے، اس کے تینوں موضوعات بڑے اہم اور ضروری ہیں، خاص طور پر اوقاف کے مسائل کی بڑی اہمیت ہے، کیونکہ اس وقت ہمارے سامنے ایک بڑا مسئلہ وقف ترمیمی قانون کا ہے، جس کو لیکر آل انڈیا مسلم پرسنل بورڈ کے ارکان اور ہمارے علماء بڑی محنت وکوشش کر رہے ہیں، اس مناسبت سے بھی یہ اجلاس بہت اہم ہے، سیمینار کے تینوں موضوعات تھے:

(۱) مساجد کے اوقاف کے چند جدید مسائل
(۲) قبرستان سے متعلق جدید مسائل
(۳) تلفیق بین المذاہب اور تتبع رخص

یہ تینوں موضوعات آج کے دور میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں، بسا اوقات ایسے حالات آتے ہیں، جہاں پر ضروری احکام پر بھی عمل کرنا مشکل ہو جاتا ہے، ایسے مواقع پر ہمیں اس کا حل تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ اور دیگر ہمارے اکابرین نے ضرورت پڑنے پر دوسرے مذاہب سے استفادہ کیا ہے اور امت کے سامنے آسان حل پیش کیا ہے، اس لیے ہمیں بھی دشوار حالات میں دوسرے مذاہب سے استفادہ کر کے امت کے سامنے آسان حل پیش کرنا ہے، تاکہ وہ دین پر عمل کر سکیں اور فرائض و ضروری احکام کو انجام دینے میں کوئی چیز رکاوٹ نہ بنے، کیونکہ اگر ہم ایسا نہیں کرتے تو لوگ گناہ کا شکار ہوں گے اور دین کے اہم ضروری احکام کو چھوڑنے پر مجبور ہوں گے۔

چنانچہ تلفیق بین المذاہب اور تتبع رخص بہت اہم موضوع ہے، اس کو آج تک ایک عیب سمجھا جاتا رہا ہے، لیکن اگر ہم دین وشریعت کی روشنی میں مسائل کا حل تلاش کرنے کے لیے غور وخوض کر رہے ہیں تو یہ تلفیق ممنوع کے درجہ میں نہیں آئے گا، اگر ائمہ اربعہ اور دیگر معتبر فقہاء کی آراء کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے اور اس کے ذریعہ لوگوں کے لیے آسانی کے راستے تلاش کیے جائیں، تاکہ لوگ گناہ اور ترک فریضہ سے بچ سکیں، تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہت اہم کام ہوگا اور یہ ہمارے علماء کی ذمہ داری ہے۔

ان شاءاللہ ان تینوں موضوعات پر ہمارے علماء سیر حاصل بحث کریں گے اور کھلے دل سے بحث کریں گے اور جو تجاویز منظور ہوں گی، وہ ہمارے لیے آسانی اور شریعت پر عمل کا ذریعہ ہوں گی۔

میرے نزدیک دو چیزیں بہت اہم ہیں، اگر ان کا خیال نہ رہے تو آدمی افراط وتفریط کا شکار ہو جاتا ہے، ایک طرف اصول اور بنیاد کی مضبوطی بھی اہم ہے اور دوسری طرف فکر کی توسع اور فروعات میں مروت بھی ضروری ہے، اگر ہم جمود اختیار کر لیں گے، تو ہم کبھی آگے نہیں بڑھ سکیں گے، بلکہ ایک خاص دائرہ میں محدود ہو کر رہ جائیں گے، لیکن توسع کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم اسلامی حدود سے تجاوز کر جائیں اور عقائد، اصول اور مسلمات میں لچک اختیار کر لیں، اس لیے ہمیں تمام چیزوں کو سامنے رکھ کر غور کرنا ہے، عقائد اور مسلمات سے بال برابر سمجھوتہ کرنے کی اجازت نہیں، البتہ جن چیزوں میں اجازت ہے اور جو فروعات کا درجہ رکھتی ہیں، ہمیں ان کے اندر اصول وقواعد اور فقہاء کے اقوال کی روشنی میں غور کرنا ہے اور امت کے سامنے شریعت کو قابل عمل بنا کر پیش کرنا ہے، تاکہ وہ آسانی سے اس پر عمل کر سکیں اور ترک فریضہ کے گناہ سے بچ سکیں۔

اصل تو یہی ہے کہ مسالک اور فقہاء کے اقوال ترجیح کے لیے ہیں اور دین واسلام تبلیغ کے لیے ہے، مسالک میں ترجیح ہونی چاہیے اور اسلام کی تبلیغ ہونی چاہیے، اس کے برعکس کرنے کی اجازت نہیں ہے، اگر مسالک کی تبلیغ ہوگی تو اس سے فرقہ واریت اور انتشار پیدا ہوگا، البتہ ہمیں تمام مسالک سے استفادہ کرنا ہے تاکہ ہمیں شریعت پر عمل کرنے میں رہنمائی مل سکے۔

مجھے امید ہے کہ یہ سیمینار اپنے مقصد میں کامیاب ہوگا، ہمیں اس سے بہت کچھ روشنی ملے گی اور پیچیدہ مسائل کو حل کرنے میں مدد ملے گی۔

میں شکر گزار ہوں حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا فضل الرحیم مجددی، مولانا سفیان قاسمی اور دیگر علماء اور فضلاء کا جو اس اجلاس میں شریک ہوئے اور جنہوں نے موضوعات کو لے کر بڑی محنتیں کیں اور مضامین ومقالات مرتب کئے، جن کے ذریعہ سوالات وجوابات کو حل کرنے میں مدد مل رہی ہے۔ اسی طرح میں دار العلوم کے اساتذہ، مجلس کے معاونین اور باحثین بھی کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ وہ اس سیمینار کو کامیاب بنانے میں نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں۔

اللہ تعالی ہم سب کو صحیح باتوں کا الہام فرمائے اور مسائل کو حل کرنے میں مدد فرمائے، آمین یارب العالمین۔

تعلیم الحدیث

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آخری وصیت

عبدالرشید راجستھانی ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

عَن عَبدِ اللّٰہِ بنِ عَبَّاسٍ وَعَائِشَةَ رضي الله عنهما قَالَا: لَمَّا نَزَلَ بِرَسُولِ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، طَفِقَ يَطرَحُ خَمِيصَةً لَهُ عَلَى وَجهِهِ، فَإِذَا اغتَمَّ بِهَا كَشَفَهَا عَن وَجهِهِ، فَقَالَ وَهُوَ كَذٰلِكَ: لَعنَةُ اللّٰہِ عَلَى اليَهُودِ وَالنَّصَارَى، اتَّخَذُوا قُبُورَ أَنبِيَائِهِم مَسَاجِدَ، يُحَذِّرُ مَا صَنَعُوا.

(متفق علیہ)

ترجمہ: جب اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کا وقت قریب ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے چہرے پر چادر ڈالنے لگے، اور جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گھٹن محسوس ہوتی تو اسے ہٹا لیتے۔ پھر اسی حالت میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "اللہ کی لعنت ہو یہود و نصاریٰ پر، جنہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا۔" آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی امت کو ان کے عمل سے ڈرا رہے تھے۔

تشریح: یہ حدیث دراصل اس بات کی طرف واضح اشارہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سب سے بڑی فکر یہ تھی کہ امت کسی بھی حال میں توحید کے راستے سے نہ ہٹے۔

اسلام کا سب سے بنیادی اصول اللہ کی توحید ہے، عبادت اور بندگی صرف اسی کے لئے خاص ہے۔ اگر کوئی قوم اپنے نیک بندوں یا انبیاء کے مقابر کو عبادت کی جگہ بنالے، ان کے سامنے جھکے، ان سے حاجتیں مانگے اور ان کو بندگی کے مرتبے تک پہنچادے تو توحید مجروح ہوجاتی ہے اور انسان مخلوق پرستی میں مبتلا ہوجاتا ہے۔

یہی روش یہود و نصاریٰ میں پیدا ہوئی تھی اور اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان پر لعنت فرمائی۔

ان ہدایات کی روشنی میں امت پر لازم ہے کہ زیارتِ قبور کو اس کی اصل حیثیت تک محدود رکھے جو شریعت سے ثابت ہے۔ قبروں کی زیارت جائز ہے تاکہ انسان کو آخرت یاد آئے، موت کی حقیقت سامنے آئے اور مرنے والوں کے لئے دعائیں کی جائیں۔

لیکن قبروں کو سجدہ گاہ بنانا، ان پر عمارتیں اور گنبد کھڑے کرنا، انہیں حاجت روائی کا مرکز سمجھنا یا وہاں عبادت کے طریقے ایجاد کرنا سب وہ رویے ہیں جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سختی کے ساتھ روکا ہے۔

آج کے زمانے میں مختلف علاقوں میں یہ رجحان عام ہے کہ قبروں پر میلے لگتے ہیں، چراغاں ہوتا ہے، منتیں مانی جاتی ہیں اور ان سے دعائیں طلب کی جاتی ہیں۔ یہ سب انہی راستوں سے مشابہ ہیں جن پر پچھلی امتیں چل پڑی تھیں اور جو ان کی گمراہی اور بدبختی کا سبب بنے۔

ان احادیث کا پیغام ہمارے لئے نہایت واضح ہے۔ ہمیں اپنے ایمان اور عقیدے کی بنیاد کو محفوظ رکھنا ہے اور اس بات کا دھیان رکھنا ہے کہ ہماری عقیدت، احترام اور محبت کہیں عبادت میں تبدیل نہ ہو جائے۔ عبادت صرف اللہ کے لئے ہے، سجدہ صرف اسی کے سامنے ہے اور دعا اور حاجت صرف اسی سے طلب کی جاسکتی ہے۔

یہ کلمات جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی آخری سانسوں میں بھی دہرائے، دراصل ہماری رہنمائی کرتے ہیں کہ امت کی اصل بقا اسی میں ہے کہ وہ توحید پر ڈٹی رہے اور شرک اور بدعات کے راستے سے دور رہے۔

اس پیغام کو آج کے مسلمان کو اپنے دل میں جگہ دینی ہے۔ ہمیں اپنی اولاد کو یہ سبق دینا ہے کہ توحید ہی دین کی بنیاد ہے، اسی میں امت کی عزت ہے اور اسی میں فلاح ہے۔

ہمیں اپنے معاشرہ میں اس بات کی اصلاح کرنی ہے کہ مقبروں اور مزاروں کو عبادت کی جگہ نہ بنایا جائے، بلکہ انہیں عبرت اور یادِ آخرت کا مقام سمجھا جائے۔

اولیاء اللہ اور نیک بندوں کی یاد ہمیں عملِ صالح کی طرف متوجہ کرے، لیکن اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیت یہی ہے اور یہی امت کے لئے سب سے بڑی رہنمائی ہے کہ وہ ایمان کی حفاظت کرکے دنیا اور آخرت میں سرخرو ہو۔

فوائدِ حدیث: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سب سے بڑی فکر وفات کے وقت بھی امت کو توحید پر قائم رکھنا تھی۔

قبروں کو عبادت گاہ بنانے کی حرمت کا اعلان کیا گیا تاکہ عقیدت عبادت میں نہ بدل جائے۔

شریعت نے زیارتِ قبور کو جائز رکھا، مگر اس کی غرض صرف عبرت و دعا ہے نہ کہ مراسمِ عبادت۔

یہ حدیث امت کے لئے معیار ہے کہ محبت میں اعتدال رکھا جائے اور غلو سے بچا جائے۔ اس میں شرک کے اسباب کو ابتدا ہی میں بند کرنے کی تعلیم ہے تاکہ امت محفوظ رہے۔

فقہی مسائل

سوال و جواب

مفتی محمد ظفر عالم ندوی (استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء)

سوال: کیا ناپاک اشیاء سے علاج و معالجہ شرعاً درست ہے؟ مثلاً آج کل آیورویدک کی بعض دواؤں میں گائے کا پیشاب شامل کیا جاتا ہے، کیا ان دواؤں کے استعمال کی شرع میں اجازت ہے؟

جواب: فقہاء نے دواءً اس کی اجازت دی ہے، اس لیے اگر متبادل دوا دستیاب نہ ہو اور ماہر تجربہ کار ڈاکٹر ازراہِ علاج حرام اشیا سے ملی دوا استعمال کی تجویز کریں، شرعاً اس کے استعمال کی گنجائش ہے، امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے انگلیوں میں داخل کرنے کو بھی جائز لکھا ہے، اور صاحب فتاویٰ بزازیہ نے اس کو مفتی بہ قول قرار دیا ہے۔

[بزازیہ علی ہامش الہندیہ: 6/367]

سوال: مردہ انسان کے اعضاء سے استفادہ درست ہے یا نہیں؟ مثلاً اگر کسی کا ایکسیڈنٹ ہوا اور موقع پر انتقال کر گیا، جسم میں ابھی حرارت باقی ہے، اگر اس کے کسی عضو کو نکال کر دوسرے ضرورت مند انسانی جسم میں پیوند کر دیا جائے، جیسے گردے یا آنکھ کی قورنیہ تو کیا شرعاً اس کی اجازت ہے؟

جواب: عصر حاضر کے فقہاء نے مردے کے اعضاء سے بوقت ضرورت ورثہ کی اجازت سے جائز قرار دیا ہے، البتہ زندہ انسانوں کے اعضاء کے استعمال سے عام طور پر فقہاء نے منع فرمایا ہے۔

[بدائع الصنائع: 7/177]

تاہم موجودہ دور میں محفوظ اور شائستہ طریقہ علاج موجود ہونے کی وجہ سے کچھ شرائط کے ساتھ زندہ انسانوں کے استعمال کی اجازت دی گئی ہے، شرائط میں اہم شرط عضو عطیہ کرنے والے کا نقصان نہ ہو اور ماہر اطباء کی اجازت ہو۔

سوال: ان دنوں ایک سوال یہ بھی آتا ہے کہ اعضاء انسانی کی خرید و فروخت درست ہے یا نہیں؟

جواب: فقہاء نے اعضاء انسانی کی خرید و فروخت کو ممنوع قرار دیا ہے، کیونکہ یہ انسانی حرمت و کرامت کے خلاف ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ آزاد انسان کا کوئی جزء اس کی ملک نہیں ہے کہ وہ فروخت کی جاسکے، البتہ بوقت ضرورت کسی انسانی جان کو بچانے کے لیے عطیہ کی اجازت ہے، جیسے کوئی اپنا خون کسی دوسرے ضرورت مند انسان کو عطیہ کر سکتا ہے، فروخت نہیں کر سکتا۔

[البحر الرائق: 6/8]

سوال: کیا کسی غیر مسلم کے اعضاء کسی مسلمان کے جسم میں لگائے جا سکتے ہیں؟ جیسے گردے یا آنکھ کی قورنیہ وغیرہ؟

جواب: موجودہ دور کے اہل فقہ و فتاویٰ نے اس کو جائز قرار دیا ہے، البتہ خون کی منتقلی میں احتیاط سے کام لینا چاہیے، کیونکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ ایک کے اثرات دوسرے تک بذریعہ خون منتقل ہوتے ہیں، اس لیے خون چڑھانے میں صحت مند اور صالح شخص کا خون لینے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

[رد المحتار: 5/246]

سوال: آج کل میڈیکل سائنسی ترقی میں ایک اہم پیش رفت یہ بھی ہوئی ہے کہ اگر کسی انسان کا لیور [Liver] خراب ہو گیا ہو تو دوسرے کے لیور کا کچھ حصہ محفوظ طریقہ سے منتقل کر دیا جاتا ہے، اس طریقۂ علاج کی کامیابی یہ بتائی جاتی ہے کہ مریض کا بھی فائدہ ہو جاتا ہے اور لیور کا ایک حصہ دینے والے کا کوئی نقصان نہیں ہوتا بلکہ چند مہینوں میں دونوں لیور کامل اور صحت مند ہو جاتے ہیں، اس بارے میں شریعت کیا کہتی ہے؟

جواب: جب مریض کا فائدہ ہو اور عطیہ کرنے والے کا نقصان بھی نہ ہو تو شرعاً اس کی اجازت ہے، اس موضوع پر معاصر فقہاء نے بحث و تحقیق کے بعد اجازت دی ہے۔

سوال: ایک شخص نے اپنی بیماری کی حالت میں اپنی جائیداد اور مکان سے متعلق ایک اقرار نامہ لکھوا کر عدالت میں رجسٹری کروا دیا ہے، مقصد یہ ہے کہ لڑکیوں کو اس سے بے دخل کر دیا جائے، کیا ان جائیدادوں اور مکان سے لڑکیاں محروم ہو جائیں گی؟

جواب: مرض الموت میں لکھا یا ہوا اقرار نامہ یا ہبہ نامہ وصیت کے حکم میں ہوتا ہے، اور وصیت وارث کے حق نافذ نہیں ہوتی ہے جب تک کہ دوسرے ورثاء اجازت نہ دیں، لہٰذا دیگر ورثہ کی رضا مندی کے بغیر یہ اقرار نامہ یا ہبہ نامہ شرعاً ناقابل عمل ہے اور اس میں شرعی طور پر میراث جاری ہوگی اور لڑکیوں کا بھی اس میں حق ہوگا۔

[الدر المختار مع رد المحتار: ج ۸/ص ۴۹۳]

فرزند ندوہ

اودھی شرافت اور ندوی حکمت کا دلکش مجموعہ

مولانا مسعود علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

شاہ اجمل فاروق ندوی (دہلی)

تحریکات سے وابستہ شخصیات صلاحیتوں کے لحاظ سے یکساں نہیں ہوتیں۔ مختلف مزاجوں اور صلاحیتوں کے حامل افراد کسی ایک تحریک سے وابستہ ہوتے ہیں اور مختلف میدانوں میں خدمات انجام دیتے ہیں۔ کوئی تحقیق وتصنیف کے میدان میں آگے ہوتا ہے تو کوئی وعظ وارشاد کے میدان میں۔ کوئی انتظامی امور میں طاق ہوتا ہے تو کوئی منصوبہ سازی میں۔ کسی کے حصے میں اللہ تعالیٰ شہرت لکھ دیتا ہے تو کسی کے حصے میں گم نامی۔ میدانوں کا یہ اختلاف اور شہرت وگم نامی کا تقدیری فرق کسی انسان کی عظمت یا سطحیت کی دلیل نہیں بن سکتا۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ انسان نے اپنی صلاحیت کے مطابق مثبت خدمات انجام دیں یا نہیں؟ یعنی اصل مسئلہ میدانوں کے اختلاف یا شہرت وگم نامی کا نہیں، صلاحیتوں کے استعمال کا ہے۔ یہ تمہید اس لیے باندھنی پڑی کہ آج ہمیں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ایک ایسے سپوت کا تذکرہ کرنا ہے، جو اپنی بلند وبالا شخصیت کی وجہ سے اپنے دور میں جہاں ہوتا وہاں میر مجلس کی حیثیت رکھتا تھا، لیکن تحقیق وتصنیف کے میدان کا شہسوار نہ ہونے کی وجہ سے آج اکثر لوگ اُس کی عظمت اور متنوع خدمات سے واقف نہیں، یعنی مولانا مسعود علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ۔

مولانا مسعود علی ندویؒ بارہ بنکی کے ایک گاؤں بھیارہ میں ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے تھے۔ والد محترم قدوائی خاندان کی ایک شاخ سے تعلق رکھتے تھے۔ مولانا کو ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۹۰۴ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل کیا گیا۔ خاندانی وجاہت کی وجہ سے چال ڈھال اور اوڑھنے پہننے میں بھی نہایت وجیہ تھے۔ گفتگو کا سلیقہ فطری طور پر ودیعت ہوا تھا۔ اس لیے بچپن سے ہی اساتذہ کے منظورِ نظر رہے۔ ان کی پوری تعلیم ندوے کی تھی۔ اپنی اس تعلیم کو انھوں نے اس طرح ہضم کیا کہ آگے چل کر جس ادارے، جس تحریک اور جس ایوان میں پہنچے، وہی چھائے رہے۔

مولانا مسعود علی ندوی بنیادی طور پر ایک منتظم تھے۔ اس کے ساتھ علم وادب میں بھی ان کا پایہ بلند تھا۔ تصنیف وتالیف سے مناسبت نہیں تھی، اس لیے بعض لوگوں نے انھیں نرا منتظم سمجھ لیا۔ لیکن علامہ حبیب الرحمان خاں شروانیؒ، علامہ سید سلیمان ندویؒ، علامہ عبدالباری ندویؒ، شیخ خلیل عربؒ، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ، ڈاکٹر ذاکر حسینؒ، ڈاکٹر رفیع احمد قدوائیؒ، ڈاکٹر سید محمودؒ اور اپنے وقت میں ان جیسے نہ جانے کتنے اعاظم رجال سے ان کے بے تکلف روابط اور ان کے ساتھ آئے دن ہونے والی طویل ملاقاتوں میں چھائے رہنے کی صفت اعلیٰ فضل وکمال کے بغیر ممکن نہیں تھی۔ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے بقول: ”میں نے ان سے بہتر اور دلچسپ مجلسی گفتگو کرتے ہوئے کم کسی کو پایا۔ ان کے سامنے کسی کی پیش نہ جاتی۔ جس مجلس میں ہوتے انھی کا رنگ جمتا۔“

اپنے فضل وکمال کے باوجود مولانا مسعود علی ندوی نے انتظام وانصرام کو ہی اپنا میدان بنایا، یہ بھی ان کی دیانت کی اعلیٰ دلیل تھی۔ وہ چاہتے تو اپنی فطرت پر جبر کر کے شوق تصنیف پورا کر ہی لیتے۔ لیکن انھوں نے ایسا نہ کیا۔ اپنے اصل ذوق اور صلاحیت کو پہچانا۔ اسی کے ذریعے ملک وملت کی عظیم خدمت انجام دی۔

مولانا مسعود علی ندویؒ، علامہ شبلی نعمانیؒ کے مخصوص تلامذہ میں تھے۔ انھوں نے اپنے استاد کو اپنا مقتدا بنایا تھا اور استاد عالی مقام نے ان کی صلاحیتوں کے مطابق انھیں تیار کیا تھا۔ انھوں نے اپنے رفقا علامہ سید سلیمان ندوی اور مولانا عبد السلام ندوی کی طرح اپنے استاد کے علمی وفکری مشن کی تکمیل کا جو عہد کیا تھا اسے آخر تک نبھایا۔ علامہ شبلی نے ان کی انتظامی صلاحیت کو کس طرح صیقل کیا تھا، اس کا اندازہ ان ۳۳/خطوط سے ہوتا ہے جو مکاتیب شبلی کی جلد دوم میں موجود ہیں۔ شاگرد ایک کام نمٹا کر فارغ نہیں ہوتا کہ استاد دوسرا کام اس کے سپرد کر دیتا ہے۔ ان کاموں سے استاد کے اپنے شاگرد پر کامل اعتماد کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی اعتماد وتعلق کا نتیجہ تھا کہ مولانا مسعود علی ندویؒ نے علامہ شبلی نعمانیؒ کی وفات کے بعد دارالمصنّفین کے انتظامی معاملات پوری طرح اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ سچ یہ ہے کہ دارالمصنّفین کے تین بانیوں یا معماروں میں سے مولانا مسعود علی ندوی نے اس علمی جزیرے اور باقی علمی دنیا کے درمیان پل کا کام کیا ہے۔ وہ نہ ہوتے تو دنیا کو سلیمانی جاہ وجلال اور علمیتِ عبدالسلام کا اندازہ کیسے ہوتا، کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ مولانا شاہ معین

الدین احمد ندوی نے لکھا ہے:

''دار المصنّفین کے تین معمار تھے۔ حضرت سید صاحب ؒ، مولانا عبدالسلام صاحب ندویؒ اور مولانا مسعود علی ندویؒ۔ اول الذکر دونوں بزرگ بہت پہلے اس دنیا سے اٹھ چکے تھے۔ اس قافلے کے آخری مسافر مولانا مسعود علی صاحب ندویؒ نے بھی ۲۷/اگست (۱۹۶۷ء) کو جنت کی راہ لی۔ ان تینوں نے مل کر دار المصنّفین کو پروان چڑھایا تھا۔ حضرت سید صاحب اور مولانا عبدالسلام صاحب نے علمی حیثیت سے دار المصنّفین کا نام اونچا کیا اور اس کی شہرت کو عالم گیر بنایا اور مولانا مسعود علی صاحب نے انتظامی حیثیت سے اس کو ترقی دی اور اس کا مقامی وقار قائم کیا۔ مرحوم سراپا قوت و عمل تھے۔ انھوں نے اپنے دور میں بڑے بڑے عملی کام کیے اور مولانا شبلی سے نسبت رکھنے والے اداروں کو فائدہ پہنچایا۔ دار المصنّفین کی تمام عمارتیں، دار العلوم ندوۃ العلماء کی عالی شان مسجد، شبلی کالج کا وسیع کانوکیشن ہال انھی کے ذوقِ تعمیر کی یادگار ہیں۔ جب تک یہ عمارتیں قائم ہیں ان کا نام زندہ رہے گا۔''

مولانا مسعود علی ندویؒ کی زندگی کا یہ پہلو بہت اہم ہے کہ انھوں نے مختلف حیثیتوں سے ہندستان کی جنگ آزادی میں اہم کردار نبھایا تھا۔ وہ علی برادران کے معتمد خاص اور تحریک خلافت کے ممتاز قائدین میں شامل تھے۔ بعد میں ترک موالات کی تحریک چلی تو اس میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ پنڈت موتی لال نہرو اور اُن کے بیٹے پنڈت جواہر لال نہرو سے بھی ان کے بے تکلف روابط رہے۔ پنڈت نہرو کے وزیر اعظم بننے کے بعد بھی وہ اُن سے بے تکلف رہے، حتی کہ اُن کو دار المصنّفین کا لائف ممبر بھی بنا لیا تھا۔ پنڈت جی بھی مولانا کا بے حد احترام کرتے تھے اور خود کہہ کر اُن کے مہمان ہوتے تھے۔

تحریک ندوۃ العلماء سے مولانا مسعود علی ندویؒ تاحیات وابستہ رہے۔ دار العلوم ندوۃ العلماء مولانا کی تعلیم وتربیت کا اول و آخر مرکز تھا، اس لیے اپنی مادر علمی کی خدمت کرنے میں مولانا ہمیشہ پیش پیش رہے۔ ۱۹۳۳ء میں جب ندوے میں مسجد کی تعمیر کا مرحلہ درپیش ہوا تو ناظم ندوۃ العلماء مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ نے مولانا سے اس محاذ کو سر کرنے کی گزارش کی۔ مولانا نے ندوہ میں قیام فرمایا اور مسجد کے تعمیری و مالی مسائل حل فرما کر بقول خواجہ حسن نظامی ''بنگلۂ خدا'' کھڑا کر دیا۔ اس کے علاوہ ندوے میں دفتر اہتمام کے لیے مولانا محمد عمران خان ندویؒ، الضیاء کی ادارت کے لیے مولانا مسعود عالم ندویؒ اور تدریس کے لیے مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ اور مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ جیسی عبقری شخصیات کا انتخاب و تقرر بھی مولانا مسعود علی ندویؒ کی دور اندیشی و رجال شناسی کا عظیم مظہر ہے۔ اسی لیے مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے ندوہ کے دورِ جدید کے ارتقا کو مولانا مسعود علی ندویؒ کا کارنامہ قرار دیا ہے۔

مولانا مسعود علی ندویؒ نہایت سرگرم اور ولولہ انگیز زندگی گزارنے کے ساتھ اصلاحِ باطن سے غافل نہیں رہے۔ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ وابستہ ہوئے، حتی الامکان ریاضت و مجاہدے میں مشغول رہے۔ آخر کار حکیم الامت کے مجازِ صحبت قرار پائے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ مرشد تھانوی کے یہاں فنائیت اور نظم وضبط کو اصلاح ذات میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ یقیناً انھوں نے مولانا مسعود علی ندویؒ کی زندگی میں ان دونوں صفات کا مشاہدہ کر کے ہی اپنا مجاز قرار دیا ہوگا۔ یہ مولانا مسعود علی ندویؒ کی زندگی کا حیرت انگیز اور مثالی پہلو ہے۔

انتہائی سرگرم زندگی گزار کر، امت کو بہت کچھ دے کر اور اپنے لیے بے حساب صدقۂ جاریہ چھوڑ کر ۲۷/اگست ۱۹۶۷ء کو ندوہ کا یہ قابل فخر فرزند اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ اُن کی زندگی میں ہمارے لیے نصیحت کا بڑا سامان ہے۔

❁❁❁

الحمد للہ ربّ العٰلمین

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ

سبھی خوبی سبھی تعریف ہے اللہ کو زیبا
بزرگی ہے اسی آقائے عالی جاہ کو زیبا
وہ ہے سارے جہانوں کا خدائے برتر و بالا
برابر ساری مخلوقات کا ہے پالنے والا
بہت ہی مہرباں ہے وہ بڑا ہی مہرباں ہے وہ
سدا رحمت رحمت فشاں ہے وہ
وہی روزِ قیامت کا اکیلا حکمراں ہوگا
کسی کا مشورہ ہوگا نہ کوئی درمیاں ہوگا
خداوندا! ترے آگے ہم اپنا سر جھکاتے ہیں
تجھی کو پوجتے ہیں بس تجھی سے لو لگاتے ہیں
خداوندا! تجھی سے چاہتے ہیں ہم مددگاری
تجھے آتی ہے اپنے آرزومندوں کی دل داری
دکھا دے ہم کو سیدھی راہ، سیدھی راہ پر لے چل
جنھیں تو نے نوازا ہے انہیں کی راہ پر لے چل
نہ ان کی راہ پر لے چل، خدائی مار ہے جن پر
تری پھٹکار ہے جن پر، تری دھتکار ہے جن پر
نہ ان کی راہ پر لے چل، بھٹک کر رہ گئے ہیں جو
ملمع کی طرح چمکے، چمک کر رہ گئے ہیں وہ

❁❁❁

تاریخ ہند

جنگِ آزادی کے چند اہم واقعات

ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی (معتمد مال ندوۃ العلماء لکھنؤ)

عام طور پر ایسے موقعوں پر چاہے وہ یوم آزادی کا جشن ہو یا 26 جنوری کا یوم جمہوریہ ہو، جب ملک کا آئین نافذ کیا گیا تھا، ہم اپنی حصولیابیوں اور ناکامیوں کا احتساب کرتے ہیں۔ یقیناً اتنے عرصے میں جہاں ہم نے بے حساب ترقیاں کی ہیں وہیں لاتعداد مسائل کا بھی سامنا ہم کر رہے ہیں۔ دراصل آج کا موضوع بہت وسیع ہے، اور بہت سے مسائل ہیں، ان میں آج سب سے اہم مسئلہ جو ہمیں درپیش ہے وہ ہے فرقہ پرستی۔

سب سے پہلے ہمیں اس امر کی تشہیر کرنی چاہئے کہ ہندوستان کی جنگ آزادی میں ملک کے تمام فرقوں، ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سب نے اہم کردار نبھایا ہے اور اس میں بھی مسلمانوں کا رول آبادی کے تناسب کے لحاظ سے کہیں زیادہ نمایاں ہے۔ اس تعلق سے چند واقعات قابل ذکر ہیں:

آج جس ایودھیا کو ہندو مسلم منافرت کی علامت تسلیم کیا جانے لگا ہے بہت کم لوگ واقف ہیں کہ وہی اجودھیا 1857ء کی جنگ آزادی کے دوران ہندو مسلم اتحاد اور یکجہتی کی بہترین مثال بنی تھی۔ اجودھیا میں ایک مشہور جگہ ہے، جس کو کبیر کا ٹیلہ کہتے ہیں اور جہاں پر املی کی جھاڑ آج بھی موجود ہے۔ اس ٹیلے پر آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا نے ایک بورڈ پر لکھ کر لٹکا دیا ہے۔ اس بورڈ پر لکھا ہے کہ 1857ء کی جنگ آزادی کے دوران اجودھیا میں اس جگہ پر بابا رام شرن داس اور مولوی عامر علی کو انگریزوں نے پھانسی دی تھی جس کی خاص بات یہ تھی کہ ان دونوں لوگوں کی گردنوں کو ایک ہی پھانسی کے پھندے میں ڈال کر لٹکا دیا گیا تھا۔ ہندو مسلم بھائی چارے کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہوسکتی ہے۔ ایسے ایسے مجاہدین آزادی ہمارے ملک میں موجود تھے جن کی قربانیوں کو لوگ بھول چکے ہیں۔ اس طرح کی ایک اور مثال ہریانہ میں ایک جگہ پاس کی ہے۔ وہاں پر اسی جنگ میں حکم چند جین اور منیر بیگ کے نام بھی قابل ذکر ہیں جو انگریزوں کے خلاف تحریک میں شامل تھے اور انگریز ان کی تلاش میں تھے۔ انگریزوں نے پٹودی ''نابھا'' کپورتھلا اور کشمیر کے راجاؤں کی مدد سے انھیں گرفتار کرلیا اور جس جبر اور ظلم کا مظاہرہ انگریزوں نے کیا اس کی مثال تاریخ کے اوراق میں بہت کم ملے گی۔ انگریزوں نے دونوں مجاہدین آزادی کو ایک دردناک اور غیر انسانی سزا دی۔ حکم چند جین کو ان کے مذہبی عقیدے کے خلاف زندہ دفنا دیا گیا جب کہ منیر بیگ کو ہندو عقیدے کے مطابق زندہ چتا پر جلا دیا گیا۔ کیا ہم لوگ یوم آزادی کے دن ان دونوں سورماؤں کو یاد کرتے ہیں؟

جب نیل کی پیداوار کے سلسلے میں 'چمپارن ستیہ گرہ' جس کو گاندھی جی نے اپریل ۱۹۱۷ء میں شروع کیا تھا، کے موقع پر وہ موتیہاری پہونچے تو ان کے کھانے پینے کا انتظام بٹک میاں انصاری نامی ایک خانسامہ کو سونپا گیا۔ انگریزوں نے بٹک میاں انصاری کے خاندان والوں کو یرغمال بنالیا تھا اور ان سے کہا تھا کہ کھانا کھلاتے وقت آپ گاندھی جی کے کھانے میں زہر ملا دیجئے گا۔ بٹک میاں بہت فکرمند ہوئے، نہ چاہتے ہوئے بھی انھوں نے گاندھی جی کے کھانے میں زہر ملا دیا۔ اس سے تھوڑا پہلے بٹک میاں کے ایک بچے کا قتل کرکے ان کی لاش ان کے پاس بھیج دی گئی تھی۔ لیکن جیوں ہی گاندھی جی اس زہر سے بھرے کھانے کے پیالے کو اپنے منھ کے پاس لے گئے بٹک میاں نے ان کے ہاتھ سے پیالہ چھین کر پھینک دیا اور گاندھی جی کے پوچھنے پر انھوں نے پیالہ پھینکنے کی وجہ بتائی اور یہ بھی بتایا کہ اس کے سبب ان کا ایک بچہ شہید ہوچکا ہے اور پیالے میں زہر نہ ملانے پر ایک اور خاندان کے بچے کی شہادت کا امکان تھا۔ گاندھی جی کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور انھوں نے محسوس کیا کہ ہمارے ملک کے شہری کتنے وفادار اور محب وطن ہیں اور ملک کے لیے وہ بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آج کتنے لوگ بٹک میاں کی اس قربانی کو جانتے ہیں اور انھیں یاد کرتے ہیں۔ کیرالا میں مہاتما گاندھی کی عدم تعاون تحریک کی حمایت میں مسلمانوں نے جو بغاوت کا جھنڈا بلند کیا وہ مپیلا ریبلین کے نام سے مشہور ہے۔

دراصل ہندوستان میں سب سے پہلے مسلمان کیرالا میں ہی آئے اور ہندوستان کی سب سے پہلی مسجد کیرالا میں ہی تعمیر ہوئی۔ کیرالا کے مسلمانوں کو مپیلا مسلمان کہا جاتا ہے۔ وپن چندرا نے اپنی کتاب 'مپیلا ریبلین' کے 17 ویں چپٹر میں لکھا ہے کہ مہاتما گاندھی کے ذریعے چھیڑے گئے 'عدم تعاون تحریک' کا ساتھ دینے کے جرم میں ۲۳۳۷ مپیلا مسلمانوں کو ۱۹۲۱ء میں پھانسی دے

دی گئی۔اس وقت کے لیڈر حاجی قل محمد کے مطابق غیر سرکاری رکارڈ میں یہ تعداد ۴۵۴۰۵ لکھی ہے۔ جلیان والا باغ میں جنرل ڈائر نے نہتے بوڑھوں، عورتوں ،بچوں سمیت جتنے لوگوں پر گولیاں چلوائی تھیں اس کی تعداد قریب ایک ہزار بتائی جاتی ہے۔ دونوں ہی واقعات کو ہمیں یاد کرنا چاہئے۔ جلیان والا باغ قتلِ عام کو تو ہم یاد کرتے ہیں لیکن مپیلا ریبلین کو ہم لوگ نہیں یاد کرتے۔

لکھنؤ کے کاکوری قصبہ میں جنگ آزادی میں حصہ لینے والے لوگوں کی مالی امداد کے لئے اشفاق اللہ خاں، رام پرساد بسمل اور دوسرے ساتھیوں نے ایک ٹرین لوٹی اور انگریزوں نے ان دونوں کو انڈومان نکوبار بھیج کر کالا پانی کی سزا دی اور بعد میں وہیں پر انھیں پھانسی دے دی گئی۔ جب اشفاق اللہ خاں سے پھانسی سے پہلے ان کے گھر والے ان سے ملنے گئے تو انھوں نے کہا اے میرے گھر والو! تم ان آنسوؤں کو روک لو۔ کیا تمہیں اس بات کی خوشی نہیں ہے کہ ہر سال جب آزادی کا دن آئے گا تو رام پرساد بسمل، کنھیا لال اور کھدی رام بوس کے ساتھ تمہارے بھائی اشفاق اللہ خاں کا بھی نام لیا جائے گا۔ گاندھی جی کے نمک آندولن کے سلسلے میں ہوئے ڈانڈی مارچ (۱۲مارچ ۱۹۳۰ء) کے دوران جب ان سے پوچھا گیا کہ اگر آپ گرفتار ہو جائیں گے تو اس مارچ کی قیادت کون کرے گا۔ گاندھی جی نے جواب دیا کہ اگر میں گرفتار ہو گیا تو عباس طیب ہماری جگہ لیں گے۔ گاندھی جی نے عباس طیب سے فرمایا: ”عباس دیکھنا جب میں جیل چلا جاؤں تو تمہاری مٹھی سے نمک نہ چھوٹے“۔ یہ بات ثابت کرتی ہے کہ گاندھی جی کا ذہن پوری طرح سیکولر تھا اور وہ ہندو مسلمان دونوں قوموں کے بیچ ہر دلعزیز تھے۔ مسلمانوں کی قربانی کے تعلق سے ایک اور واقعہ قابل ذکر ہے۔ 1932ء میں خان عبدالغفار خان جن کی قیادت میں پشاور کے قصہ خوانی بازار میں گاندھی جی کے نمک آندولن کی حمایت میں پٹھانوں کی ایک بھیڑ جمع ہوئی جس میں سب سے آگے بچوں کی ایک قطار تھی، ان بچوں کے بیچ خان عبدالغفار خان جنھیں فرنٹیر گاندھی کا خطاب ملا تھا، کھڑے تھے اور بچوں کے پیچھے ہزاروں پٹھان کھڑے تھے لیکن سبھی نہتے تھے، یہ منظر دیکھ کر انگریز وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے اور دو دن بعد گڑھوال رجیمنٹ کو لے کر قصہ خوانی بازار میں پہنچے تو دیکھا کہ بچوں اور پٹھانوں کے بیچ خان عبدالغفار خان اس طرح کھڑے تھے۔ پوری بھیڑ کو نہتا دیکھ کر ایک انگریز نے خان عبدالغفار خان سے پوچھا کہ ہتھیار تو پٹھانوں کا زیور ہوتا ہے، تم لوگ نہتے یہاں کیسے کھڑے ہو؟ خانصاحب نے جواب دیا کہ ہم لوگوں نے گاندھی جی سے عدم تشدد کا راستہ اپنانے کا وعدہ کیا ہے، ہتھیار اٹھانا تو دور ہے اس کی طرف اب ہم لوگ دیکھیں گے بھی نہیں۔ گڑھوال رجیمنٹ سے انگریزوں نے ان نہتے پٹھانوں پر گولیاں چلانے کے لئے کہا تو گڑھوال ریجمنٹ نے پہلے اپنی بندوقیں اوپر اٹھائیں، پھر فوراً بعد بندوقیں پھینک دیں اور کہا کہ ہمارے ملک میں ایک جلیان والا باغ ہی کافی ہے۔ پھر انگریز سپاہیوں نے بھیڑ پر فائرنگ کی جس میں ۲۰۷ پٹھان شہید ہوئے۔ جب گاندھی جی نمک آندولن کے سلسلے میں گرفتار ہوئے تھے، یہ واقعہ اس کے بعد کا ہے۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ عبدالغفار خان نے ۹۵ سال کی زندگی میں ۴۵ سال جیل میں گزارے۔ اتنی بڑی قربانی دینے والے لوگ کم ملتے ہیں۔ ایسے سورماؤں کی تاریخ پیدائش پر کم از کم چھوٹا موٹا پروگرام ضرور ہونا چاہئے۔

۱۹۶۵ء کی ہندو پاک جنگ کے دوران اس وقت کے وزیر اعظم لال بہادر شاستری نے قوم سے دفاعی فنڈ میں چندہ دینے کی اپیل کی تھی۔ اس پر نظام حیدرآباد میر عثمان علی نے لال بہادر شاستری سے کہا کہ میں آپ سے چندے کے سلسلے میں ملنا چاہتا ہوں، آپ حیدرآباد تشریف لائیں۔ اس پر شاستری جی نے اس وقت چل رہی جنگ کے سبب آنے سے معذوری ظاہر کی۔ چنانچہ اس مقصد سے حیدرآباد ایک ہوائی جہاز بھیج دیا گیا۔ بیگم پیٹھ ایئرپورٹ حیدرآباد میں لال بہادر شاستری کے ہوائی جہاز میں نظام حیدرآباد نے پانچ ہزار کلو سونا جنگ کے چندے کے طور پر بھروا دیا۔ ہندوستان کی تاریخ میں دفاعی فنڈ میں دیا گیا یہ سب سے بڑا چندہ تھا، اسی طرح بریگیڈیئر عثمان اور ویر عبدالحمید کی اپنے ملک کے لئے قربانیاں بے مثال ہیں۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد جب کشمیر کو لے کر ہندوستان اور پاکستان کے بیچ جنگ ہوئی تو بریگیڈیئر عثمان جموں وکشمیر میں پاکستانی فوج اور ملیشیا کے ساتھ ۱۹۴۸ء میں لڑتے ہوئے شہید ہو گئے تھے۔ بریگیڈیئر عثمان کے مرنے کے بعد ہندوستانی حکومت نے انھیں مہا ویر چکر میڈل سے نوازا۔ اسی طرح ۱۹۶۵ء کی ہندو پاک جنگ کے دوران لانس نایک عبدالحمید نے یک بعد دیگر پاکستان کے کئی پیٹن ٹینک توڑ کر اس کے دانت کھٹے کر دیئے لیکن اخیر میں پاکستانی بمباری میں وہ شہید ہو گئے۔ ان کی اس بہادری کے لئے انھیں فوج کے سب سے بڑے میڈل 'پرم ویر چکر' سے نوازا گیا۔ ہمارے علماء دین کی ہندوستان کی جنگ آزادی میں جو خدمات رہی ہیں اس سے ہمارے بزرگان تو شائد واقف ہوں لیکن آج کے نوجوان شاید ہی

اس حقیقت سے آگاہ ہوں۔لفٹینٹ ہاٹسن جس نے دہلی کو دوبارہ فتح کیا تھا کے پاس انگلینڈ سے ٹیلیگرام آیا جس میں لکھا تھا ۱۸۵۷ء کی بغاوت دراصل مسلمان علماء کی بغاوت ہے۔تم جہاں پر بھی ٹوپی اور داڑھی والوں کو دیکھو انھیں بنا مقدمہ کے لٹکا دو، پھر کیا تھا مجھے جہاں جہاں ٹوپی اور داڑھی والے ملے بس ہماری گولیاں ان کا سینہ اور سر تلاش کرتیں، بنا یہ پوچھے کہ انھوں نے کیا کیا؟ دو انگریز مصنفین سر جیمس اڈٹرم اور ایڈورڈ ٹمس نے اپنی ایک کتاب میں لکھا' جن ۵۱۲۰۰ لوگوں کو ۱۸۵۹،۶۰،۶۱ کے دوران پھانسی دی گئی ان میں علماء کی تعداد ۲۷۰۰ تھی۔یہ حقائق جنگ آزادی میں مسلمانوں کے شاندار کردار کو بخوبی واضح کرتے ہیں۔

ان حقائق کے بیان کا مقصد یہ تھا کہ ہم سبھی اور خصوصاً نئی نسل یہ سمجھ لے کہ جنگ آزادی میں ہندوستان کے دونوں بڑے فرقے ہندو و مسلمان کا کردار برابر رہا ہے بلکہ اگر آبادی کے تناسب سے دیکھا جائے تو مسلمانوں کی قربانی کہیں زیادہ ہے۔لہٰذا موجودہ ماحول کے مدّنظر ہم سب کو اور خصوصاً نوجوانوں کو آج کے دن عہد کرنا چاہئے کہ ہم سبھی اس بات کے لئے کوشاں رہیں گے کہ ملک میں سبھی فرقہ کے لوگ آپس میں میل محبت اور اتحاد قائم کر سکیں، سیکولرزم اور سوشلزم کو فروغ ملے، سبھی محب وطن بنیں اور ملک کی سلامتی اور بقاء کے لئے اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار رہیں۔مجاہدین آزادی کے لئے اس سے بہتر خراجِ عقیدت کوئی ہو نہیں سکتی ؎

ستم ہے جو ہمیں کہتے ہیں ظالم اور پردیسی
حقیقت ہے کہ بھارت کو کیا رشکِ جناں ہم نے

❁ ❁ ❁

سیرت طیبہ کے سلسلۃ الذہب کا نیا شاہکار

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم رحمۃ للعالمین

تالیف: حضرت مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی مدظلہ العالی

عہد حاضر میں محدثین ہند کی عظیم الشان روایات کے وارث و امین حضرت مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی دامت برکاتہم کی تصنیفی و تالیفی زندگی کی حاصل، سرور دو عالم ﷺ کی سیرت پاک سے روشنی اور رہنمائی کے لیے موجودہ عہد کے تقاضوں اور جدید انسانی معاشرہ و مزاج کی مناسبت سے حضور پاک ﷺ کی رحمۃ للعالمینی کی دلنشیں، دلنواز اور دلکش تشریح علامہ شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی کی سیرت النبی ﷺ کے سو سال بعد سیرت نگاری میں مجددانہ کارنامہ تین ضخیم جلدوں میں خیر و برکت کی حامل یہ سیرت مصطفی عرب و عجم کے اہل نظر کی داد و تحسین کے مطابق:

۱ حضور ﷺ کی ذات اور سیرت پر لکھنے کا مطلب ہے کہ حرمین شریفین پر بھی قلم اٹھایا جائے، یہ وہ نکتہ ہے جسے ڈاکٹر تقی الدین ندوی نے اس کتاب میں خاص طور پر ملحوظ رکھا۔
محمد رسول اللہ ﷺ رحمۃ للعالمین (ڈاکٹر عبداللہ بن عبدالمحسن الترکی - سابق جنرل سکریٹری رابطہ عالم اسلامی، مکہ مکرمہ)

۲ یہ سیرت پاک کے موضوع پر گراں قدر تصنیف ہے، میں اس کو شیخ ندوی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی خصوصی مہربانی اور فضل ربانی سمجھتا ہوں۔ (ڈاکٹر سعود بن ابراہیم الشریم - امام و خطیب مسجد حرام مکۃ المکرمہ)

۳ یہ جامع انسائیکلوپیڈیا ہے، مشرق و مغرب میں پوری امت اسلامیہ کے لیے گراں قدر تحفہ ہے۔
(ڈاکٹر ابولبابہ طاہر صالح حسین)

۴ یہ عظیم الشان کتاب جامعیت اور دلکشی میں بے مثال اور عظیم شاہکار ہے اور ایسی کتاب ہے جس میں افراط و تفریط دونوں انتہاؤں سے بچ کر اعتدال کا راستہ اختیار کیا گیا ہے، زبان عصر حاضر کے فہم کے مطابق ہے۔
(ڈاکٹر موفق بن عبداللہ - استاذ حدیث جامعہ ام القریٰ)

۵ بنیادی خوبی یہ ہے کہ سیرت نبوی پر لکھنے کے لیے جن باتوں کا علم ضروری ہے اس میں صاحب کتاب کمال مہارت کے حامل ہیں۔اس کے مطالعہ سے ایمان و عقیدہ کو مضبوطی حاصل ہوتی ہے۔ (مولانا سید محمد رابع ندوی)

دیدہ زیب کتابت، بہتر مجلد خوبصورت سرورق کے ساتھ تین جلدوں کا مکمل سیٹ حاصل کرنے کے لیے جامعہ اسلامیہ مظفر پور اعظم گڑھ یوپی اور دیوبند اور ندوہ کے مشہور مکتبوں سے رابطہ کیا جا سکتا ہے۔

پتہ **جامعہ بُکڈپو** جامعہ اسلامیہ مظفر پور اعظم گڑھ یوپی
موبائل نمبر: 9450876465 9532829745
قیمت: 2000 خصوصی رعایت کے ساتھ قیمت: 750

اصلاحِ حال

جذباتیت کے نقصانات

اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روشنی میں

مولانا محمد خالد غازی پوری ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

انسانی زندگی میں صبر وتحمل کی وجہ سے جس قدر مثبت نتائج سامنے آتے ہیں، اسی قدر جذباتیت انسان کے اندر جذبۂ انتقام سرعت اور انفعال کی وہ کیفیت پیدا کرتی ہے، جس کی وجہ سے وہ اپنے اوپر قابو نہیں رکھ پاتا ہے، اور زبان کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی ہاتھ بھی دراز ہو جاتا ہے، اور انسانی قدریں پامال ہو جاتی ہیں، اور ایک باعزت شخص لوگوں کی نظروں سے گر جاتا ہے، اور اس کے اخلاقی قدروں کا گراف گرتا چلا جاتا ہے، اور نیک نامی بدنامی میں تبدیل ہو جاتی ہے، اس لیے مومنانہ صفات میں اس کو شمار نہیں کیا جا سکتا ہے، جذباتیت قوت غضبیہ کا مظہر ہوتی ہے، اور بسا اوقات جذباتیت کا اسیر عجب اور کبر میں مبتلا ہو کر دنیا و آخرت کے خسران کا سبب بن جاتا ہے، اس لیے قران پاک میں جا بجا صبر کی تلقین کی گئی ہے، اور احادیث نبویہ اور سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اس کے بہتر نمونے پیش کیے گئے ہیں، جن سے جذباتیت کی نفی ہوتی ہے۔

حضرت علیؓ کے بارے میں آتا ہے:

ایک شخص نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں کوئی گستاخی کی تو آپ نے اس کو پچھاڑ دیا، اسی اثناء میں اس نے آپ پر تھوک دیا تو آپ نے اسے چھوڑ دیا اور یہ کہا کہ اگر میں کوئی اقدام کرتا تو نفسانی خواہش کی بنیاد پر جذباتی ہو کر کرتا، اس لیے میں نے گریز کیا، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ذات کے مقابلہ میں کبھی جذبات میں نہیں آتے تھے، اور جذباتیت کی بنا پر کسی سے انتقام نہیں لیتے تھے، لیکن جہاں حقوق اللہ اور شعائر اللہ کے خلاف کوئی بات ہوتی تو آپ کا غضب اور جذبہ دیدنی ہوتا تھا، اور انتقامی کاروائی بھی کرتے تھے، یا کم از کم سرزنش فرماتے تھے، کسی بھی فیصلہ میں سرعت اور جلد بازی سے کام نہیں لیتے تھے، بلکہ اس سے منع فرماتے تھے، غزوۂ خندق کے موقع پر ایک شب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے خیمے میں آواز لگائی کہ کون ہے جو ابوسفیان (کافروں کے سپہ سالار تھے) کے بارے میں یہ پتہ لگائے کہ اس وقت وہ کیا کر رہے ہیں؟ صحابۂ کرامؓ جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خیمے میں تھے، وہ سو چکے تھے، لہٰذا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین دفعہ یہ آواز لگائی، تیسری دفعہ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کا نام لے کر پکارا، حضرت حذیفہ بن یمان نے لبیک کہا اور اٹھ کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے تشریف لائے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں رخصت کرتے ہوئے فرمایا کہ بس پتہ لگا کر آؤ: "لاتذعروا علینا" ہمارے خلاف بھڑکانا نہیں، حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالی عنہ نے تیر و کمان سنبھالا اور ابوسفیان کا پتہ لگانے کے لیے نکل گئے۔

ٹھنڈک بہت زیادہ تھی لیکن خیمہ سے باہر نکلتے ہی ایسا محسوس ہوا کہ ہم کھلی فضا میں نہیں بلکہ کسی بند حمام میں ہیں، جہاں تھانے گرم کیا جاتا ہے، اور اس کی وجہ سے گرم ہوا آیا کرتی ہے، پہاڑی کے ڈھلوان سے گزرتے ہوئے ہم ابوسفیان کے قریب پہنچ گئے اور وہ اس وقت آگ جلا کر اپنے پیٹ سینک رہے تھے، ان کو دیکھ کر میں جذباتی ہو گیا اور یہ سوچا کہ سارا مسئلہ تو یہی ہے آج ایک ہی تیر میں ان کا کام تمام کیا جا سکتا ہے، میں نے تیر کو کمان میں رکھا اور نشانہ لینے ہی والا تھا کہ ادھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان سامنے آ گیا: "لاتذعروا علینا" ان کو بھڑکا کر خوف میں مبتلا نہ کرنا! لہٰذا میں رک گیا اور گرد و پیش کا جائزہ لے کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر پوری رپورٹ پیش کی، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہت خوش ہوئے، اور کمبل کا حصہ میرے جسم پر ڈال دیا اور میں گہری نیند سو گیا، خیمہ میں شدید ٹھنڈک کا احساس ہوا جبکہ باہر اس کے برعکس فضا محسوس ہوتی رہی۔

یہ اصل میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کا ثمرہ تھا، اس سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ اطاعت رسولؐ کی وجہ سے حالات تبدیل ہو سکتے ہیں، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جذباتی ہونے سے منع فرمایا تھا، جذبہ قابل قدر ہے لیکن جذباتیت انسان کو نفی کروانے پر آمادہ کر دیتی ہے۔

ایک سریہ میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو امیر لشکر بنا کر قبیلہ جہینہ کی سرکوبی کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھیجا، صبح سویرے شب خون مارنے کی کاروائی کی گئی، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ان کے سامنے اسلام پیش

کیا، انہوں نے بجائے "أسلمنا" کہنے کے "صبأنا" کہا، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اس کو انکار پر محمول کیا، اور انہیں قتل کرنے کا حکم دیا، لیکن حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ جو سریہ میں موجود تھے، آپ نے خود بھی اور دیگر رفقاء کو بھی ایسا کرنے سے منع فرما دیا، حضور اکرم ﷺ کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو آپ ﷺ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی اس جذباتیت پر نکیر کرتے ہوئے، اپنی برأت کا اظہار کیا، اس سے معلوم ہوا کہ تحمل سے کام لینا چاہیے، قوت برداشت کو پیش نظر رکھ کر اپنے آپ کو بے قابو ہونے سے بچانا چاہیے۔

آج ہمارے معاشرہ میں جذباتیت بہت زیادہ ہے، اس کی وجہ سے انفرادی اور اجتماعی نقصانات بھی بہت اٹھانے پڑ رہے ہیں، بابری مسجد کا قضیہ ہو، یا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا اقلیتی کردار، یا اس قسم کے دوسرے سماجی اور ملی مسائل، اس میں اسی جذباتیت کی کارفرمائی سے بڑا نقصان پہنچا ہے۔

حضور اکرم ﷺ اہل مکہ میں دعوت وارشاد کا کام کرتے رہے، ان کی طرف سے برابر انکار کا معاملہ ہی نہیں بلکہ ستم زاری بھی ہوتی رہی، یہ سوچ کر کہ شاید اہل طائف اس عظیم دعوت کو قبول فرما لیں اور دارین کی سعادت کے مستحق ہوں، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اپنے غلام حضرت میسرہ کے ساتھ طائف تشریف لے گئے، اور انہیں اسلام کی دعوت دی، لیکن اہل طائف نے امید کے برخلاف معاندانہ رویہ اختیار کیا، آپ ﷺ کو طعن وتشنیع، طنز وتعریض کا نشانہ بنایا گیا، اوباشوں کے ذریعے آپ ﷺ کے جسم اطہر پر خشت باری کی گئی، جس سے آپ ﷺ کا جسم اطہر لہولہان ہو گیا، آپ انتہائی پریشانی کی حالت میں وہاں سے نکلے، ہرزہ سرائی کی اور نہ ہی کسی کے خلاف دست درازی کی، بلکہ تحمل سے کام لیتے ہوئے ان کے حق میں دعا فرمائی: "اللّٰهم اهد قومي فإنهم لايعلمون" (اے اللہ! میری قوم کو ہدایت دے اس لیے کہ وہ جانتے نہیں ہیں)۔

اللہ عزوجل نے اس موقع پر جذباتیت پر قابو رکھنے کے صلہ میں حضور اکرم ﷺ کو تین انعامات سے نوازا جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱- مقام نخلہ میں اجنہ آپ کے دست حق پرست پر اسلام لائے۔

۲- مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی راہ ہموار ہوئی اور آپ ﷺ نے ہجرت فرمائی، اگر اہل طائف قدر کرتے تو آج طائف ہی مدینہ منورہ ہوتا، لیکن انہوں نے جذباتیت سے کام لیا اور قدر نہیں کی، اور نقصان اٹھائے۔

۳- اللہ عزوجل نے اس اندوہناک معاملہ کے بعد آپ ﷺ کو معراج سے نوازا، انبیاء علیہم السلام سے ملاقات ہوئی، ان کی امامت کی اور ایک معجزاتی انداز میں یہ سب کچھ ہوا، اور یہ اشارہ دیا گیا کہ آپ کی دعوت وہاں تک پہنچے گی جہاں تک آپ کی نگاہ پہنچ رہی ہے۔

صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اس راہ پر گامزن تھے، اس کے داعی بھی تھے، چنانچہ ایک موقع پر جب حضرت امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حج فرمایا، بہت سے صحابہ اور سپہ سالار لشکر ہمرکاب تھے، منیٰ میں قیام کے دوران ایک شخص نے کہا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات اگر ہوگئی تو ہم حضرت طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کرلیں گے اور اچانک بیعت پھر قابل قبول ہوجائے گی جس طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت اچانک ہوئی تھی، اور پھر استحکام ہوگیا، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ امیر المومنین کو یہ بات معلوم ہوئی تو آپ نے فوراً سب کو جمع ہونے کا حکم دیا تاکہ اس کے خلاف تقریر کریں، اس موقع پر حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ موجود تھے، انہوں نے کہا امیر المومنین! ایسا نہ کریں، جذبات میں نہ آئیں، سنجیدگی سے سوچیں، اس وقت عوام الناس کی بڑی تعداد موجود ہے، وہ آپ سے قریب ہوں گے اور آپ کی بات سنیں گے اور سمجھیں گے نہیں، اور بات کا بتنگڑ بنا دیں گے، آپ تحمل سے کام لیں اور مدینہ منورہ پہنچ کر اس مسئلہ کو اٹھائیں، وہاں منتخب مجمع ہوگا، اور آپ کی بات صحیح طور پر لوگ سمجھیں گے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس مشورہ کو قبول فرمایا، اور بڑی آزمائش سے سب لوگ محفوظ رہے۔

لہٰذا ہمیں ہر معاملہ میں سنجیدہ بننے اور تحمل کے ساتھ غور کرنا چاہیے، اور اجتماعی اور انفرادی معاملہ میں اس پر عمل کرنا چاہیے، دشمن کبھی کبھی ایسی حرکتیں کرتا ہے تاکہ ہم جذبات میں آجائیں، اقدام کریں، اور جو جذبات میں آجاتا ہے وہ آپے سے باہر ہوجاتا ہے، اپنی ذات پر قابو کھودیتا ہے، پھر کیا بولنا ہے، اور کیا کرنا ہے، اس کے نتائج کیا ہوں گے، اس سے نابلد ہوتا ہے، اور بہت بڑے نقصان کے دلدل میں پھنس جاتا ہے، لہٰذا اس سے بچنا چاہیے، اور سماجی زندگی میں اس کے بغیر کوئی تخلیقی صالح کام بھی نہیں کیا جاسکتا ہے۔

فکروفلسفہ

دنیا کے مختلف 'ازم' اور اسلام

انیس احمد ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

اللہ نے انسان کو پیدا کیا اور ساری دنیا کو اس کے لئے مسخر کیا اس لئے کہ اللہ نے اس کو اپنا خلیفہ بنا کر زمین پر بھیجا، چونکہ انسان خلیفۃ اللہ فی الارض ہے اس لئے اس کو سوچنے سمجھنے اور نئے نئے افکار ونظریات کو روئے زمین پر لانے کی صلاحیت عطا فرمائی، اللہ نے اسے علم عطا کیا جس سے اس نے دنیا کی طاقتور ترین چیزوں کو کنٹرول کرنے کا طریقہ ایجاد کیا، فضا کو، سمندروں کو اور اس کے طوفان و اضطراب کو کنٹرول کرنے کا سلیقہ و ہنر سیکھا، اللہ نے حضرت نوح علیہ السلام کو کشتی بنانے کا حکم دیا: **ان اصنع الفلک بأعیننا و وحینا** ، اس طرح انسان نے راستے بنائے، پہاڑوں کو تراش خراش کر شاندار گھر بنائے، عظیم الشان عمارتیں بنائیں، تہذیب و تمدن کو وجود بخشا، انسانوں کی جماعت میں اللہ نے قوی اور کمزور، عقلمند اور غیر عاقل، فکر مند اور لاابالی، تعلیم یافتہ اور ان پڑھ، غور فکر کرنے والا اور عام روش پر چلنے والا، سنجیدہ اور ٹھٹھول پسند ہر طرح کے انسان کو پیدا کیا، طاقتور، عقلمند اور مدبروں نے کمزوروں غیر عاقلوں اور لاابالی قسم کے لوگوں پر حکومت و تحکم شروع کیا، منظم گروپ بنے اور انھیں کو سلطنت اور حکومت کا نام دیا گیا، حکومتیں وجود میں آتی رہیں، بنتی اور بکھرتی رہیں، اس طرح پڑھے لکھے لوگوں نے ان پڑھ، جاہل اور گنوار لوگوں کو اپنے باطل نظریات سے گمراہ کرنا شروع کیا، اپنی عقل کی جولانیاں دکھاتے رہے، اور انھیں افکار ونظریات کو مخصوص نام سے وابستہ کیا گیا جسے ''ازم'' کا نام دیا گیا۔

ازم آئیڈیالوجی یا فکر ونظر کے زاویہ کو کہتے ہیں جیسے کیپٹلزم، شوشلزم، کمیونزم وغیرہ، یہ سب اپنے اپنے زمانہ کے مشہور نام نہاد مفکرین کے ذریعہ وجود میں آئے اور بعض اپنے زمانہ میں بہت مقبول ہوئے لیکن چونکہ اسلامزم (اسلامیت) کے مقابلہ میں سب غیر فطری، غیر انسانی یا ظلم و ناانصافی کے اصولوں پر قائم تھے جس میں انسانوں کی فطرت کا لحاظ نہیں کیا گیا تھا یا جس میں افراط وتفریط تھی اس لئے وہ نظریات کچھ ہی عرصہ میں ختم ہو گئے، بعض معروف ومشہور ازمس کچھ اس طرح ہیں: ۱- کیپٹل ازم ۲- شوشل ازم، ۳- کیمونزم، ۴- لبرالزم، ۵- فیمینزم، ۶- فاشزم، ۷- نیشنل ازم وغیرہ

کیپیٹل ازم: سرمایہ دارانہ نظام، یہ ایک نظام حکومت ومعیشت ہے جس میں ملک کی ساری دولت اور سارے ذرائع پر چند بڑے سرمایہ دار (افراد یا کارپوریٹ) کا ہوتا ہے جسے منافست کے طور پر فائدہ کو نظر میں رکھتے ہوئے چلایا جاتا ہے، اس میں افراد و حکومت کا ملا جلا اقتصادی نظام ہوتا ہے، اس نظام میں سرمایہ دار اپنے سرمایہ کے بل بوتے پر ملک کے نظام پر قابض ہوتے ہیں، بعض مرتبہ ملک میں برائے نام جمہوریت یا کسی اور طرز کی حکومت رہتی ہے اصلا زمام اقتدار سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہوتا ہے در پردہ انھیں کی سرکار ہوتی ہے۔

کمیونزم: ملک کے ذرائع اور اس کی ساری دولت کا مالک اسٹیٹ (سلطنت) ہوتا ہے، اس کو انقلابی شوشلزم بھی کہتے ہیں اس کی بنیاد کارل مارکس اور فریڈرکس اینگلس کے فلسفہ اور نظریات پر مبنی ہے، اس میں اسٹیٹ اور عوام دونوں ہی ذرائع دولت کے مالک تصور کیے جاتے ہیں، اس میں لوگ اپنی اپنی صلاحیت کے اعتبار سے کام کرتے ہیں اور ہر ایک کو اس کی ضرورت کے اعتبار سے اجرت یا محنتانہ دیا جاتا ہے، یعنی دولت کی مساویانہ تقسیم عمل میں آتی ہے، ملک کے ڈاکٹر، انجینئر، سیاستداں، مدبر، مفکر، پروفیسر، مالک ومزدور غرضیکہ ہر طبقہ کے ہر ہر فرد کو دولت برابر دی جاتی ہے، یہ دیکھنے اور سننے میں سب کو بھلا لگا، روس (سابقہ سوویت یونین) اور کچھ یوروپین ممالک نے اس کو آزمایا مگر ۱۹۹۰ میں روس میں کمیونزم کا خاتمہ ہو گیا، اصلا یہ ایک غیر فطری نظام سیاست ومعیشت ہے جو انسانوں کے طبقاتی اور معاشرتی نظام سے میل نہیں کھاتا، جب ہر انسان کا مزاج الگ ہوتا ہے، اسکی چاہتیں اور خواہشات الگ ہوتی ہیں ہر ایک کا علم اور مستوائے فکر وعمل ایک جیسا نہیں ہوتا تو آخر کار یہ طرز فکر کیونکر کامیاب ہوسکتا ہے یہ قرآنی تعلیم سے میل نہیں کھاتا۔

سوشلزم: اس سماجی، سیاسی اور معاشی نظام کو کہتے ہیں جس میں پیداوار تقسیم اور تبادلہ کے (جس میں تمام فیکٹریاں، ذرائع، انڈسٹری، زمین اور دولت) سب قوم کے ذریعہ منضبط کی

جائے ، اس کا بھی مرکزی نقطۂ خیال مساوات ہے تاکہ دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر نہ رہ جائے بلکہ اچھی طرح سوسائٹی کے سارے افراد کے ہاتھوں میں ان کی ملکیت ہو یعنی ایک غیر طبقاتی معاشرہ کی تشکیل عمل میں آئے۔

فاشزم: (فسطائیت) اس استبدادی سیاسی نظریہ اور تحریک کو کہتے ہیں جو بیسویں صدی کے اوائل میں وجود میں آیا خاص طور پر اٹلی میں مسولینی کے زمانہ اقتدار میں اور ہٹلر کی نازی جرمنی میں ، اسکی خصوصیات حسب ذیل ہیں، یہ ایک استبدادی نظریہ ہے جو جمہوریت اور پارلیمانی نظام کا انکار کرتا ہے، جو اقلیات اور اختلاف کرنے والے گروہوں کے حقوق کا انکار کرتا ہے جو تنوع اور رنگارنگی کو طاقت نہیں، کمزوری تصور کرتا ہے، جس میں طاقت کا محور محض ایک شخصیت یا چند چیدہ افراد ہوتے ہیں جو دوسروں سے بلا شرط وفاداری کا مطالبہ کرتے ہیں، یہ نظریہ اعلی درجہ کی قومیت کو فروغ دیتا ہے، فاسسٹ حکومتیں فوج بندی اور فوجی طاقت کو بہت عظیم بنا کر پیش کرتی ہیں اور اپنے قوانین کے نفاذ کے لئے فوجی طاقت کا سہارا لیتی ہیں ، یہ کمیونزم سوشلزم او ر لبرل جمہوریت کے مخالف تحریک سمجھی جاتی ہے جو اپنے مخصوص کرشماتی لیڈر کے تحت جس کو ملک کی مرضی کا پیکر سمجھا جاتا ہے، صرف سیاست و معیشت ہی نہیں بلکہ ثقافت، تعلیم، میڈیا اور ذاتی زندگی کو بھی اپنے مخصوص نظریہ سے ہم آہنگ کرتی ہے۔ گرچہ اس میں کمیونزم کے برخلاف ذاتی پراپرٹی اور تجارت کی آزادی ہوتی ہے لیکن اس پر حکومت کا سخت کنٹرول ہوتا ہے، فسطائیت نسل پرستی پر بھی زور دیتی ہے، یہ نظریہ بھی غیر فطری اور ناکام ہے۔

لبرلزم: اس سیاسی اور معاشی نظریہ حیات کو کہتے ہیں جو شخصی آزادی ،مساوات اور انسانی حقوق پر زور دیتا ہے، اس کا خاص فلسفہ یہ ہے کہ ہر شخص کو زندگی گزارنے کی آزادی، سوچنے، بولنے اور اپنے منتخب پیشہ کو اختیار کرنے کی مکمل آزادی ہے جب تک کہ وہ دوسروں کے لئے نقصان دہ نہ ہوں ،یعنی بولنے، مذہب اختیار کرنے، قانون کے تئیں سب کی برابری، قانون کی بالادستی، زندگی عزت و احترام کے حقوق اور تجارت اور پراپرٹی میں حکومت کا کم سے کم دخل ہوتا ہے۔

فیمینزم : معاشرتی، سیاسی اور فکری تحریک جو مرد و عورت کے حقوق، مواقع اور درجہ میں مساوات کی حمایت کرتی ہے، یہ تحریک انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں بڑے زور و شور سے اٹھی اور پورے یوروپ اور شمالی امریکہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور پھر آہستہ آہستہ پوری دنیا کو اپنی تحریک سے متاثر کیا، یہ تحریک بھی غیر فطری ہے اس لئے آج تک صرف جزئی طور پر کامیاب ہوسکی، اسی طرح دوسرے بہت سے (isms) وجود میں آئے (nationalism) (racism) گلوبل ازم وغیرہ۔

یہ سارے ازم آئے اپنے اپنے دور میں اس طرح دنیا پر چھاگئے ایسا لگا کہ صرف اسی کا بول بالا رہیگا، لیکن چند ہی برسوں میں ایسے ناپید ہوگئے جیسے کہ وہ کبھی تھے ہی نہیں، لیکن ایک ایسا ازم جو ساڑھے چودہ صدی پہلے آیا اور چند ہی برسوں میں پوری دنیا پر پوری شان و شوکت کے ساتھ جگمگانے لگا وہ ''اسلام ازم'' تھا۔

اسلامزم (اسلامیت) اس نظام حیات کو کہتے ہیں جو حیات انسانی کے ہر ہر پہلو پر شامل ہے، جو معاشی، معاشرتی، سیاسی، تہذیبی، دینی اور اخلاقی سبھی پہلوؤں پر محیط ہے، یہ محض ایک دینی پہلو، مذہبی دائرہ کار اور چند عقائد و اصول کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک مکمل دین اور مستقل تہذیب کا نام ہے، پیدائش سے وفات تک، صبح کی پو پھٹنے سے شام کے جھٹپٹے تک، دن سے رات تک، بچپن سے جوانی تک نیز جوانی سے بڑھاپے تک، دنیوی زندگی سے اخروی زندگی تک مکمل نظام حیات ہے اور زندگی کی ساری مشکلات کا حل پیش کرتا ہے۔

اسلامزم(اسلامیت) معاشرت میں اعلی انسانی اصول و اقدار کی رعایت کرکے نہایت اعلی، مثالی پر امن معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے، جس میں مرد و زن دونوں کو مکمل حقوق و اختیارات حاصل ہیں، یہ سیاسی میدان میں عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرکے امیر و غریب، کالا گورا، عربی و عجمی، محتاج و غنی، حاکم و محکوم کے درمیان حائل دیواروں کو ختم کرکے ایسا سیاستداں چاہتا ہے جو یکسر جھوٹ کا سہارا نہ لے، جو ظلم و زیادتی سے کوسوں دور رہے، جو محتاجوں کے لئے سہارا، غریبوں کے لئے ملجا و ماوی، نادار و مفلس کے لئے ہر درد کا مداوی تلاش کرے، جو اس وقت بھی زیادتی نہ کرے جب اس پر زیادتی کی جائے جو آیت کریمہ **ولا یجرمنکم شنآن قوم علی ان لاتعدلوا، اعدلوا ھو اقرب للتقوی** کا ہمیشہ التزام کرے، جو خود بھوکا رہ کر دوسروں کا پیٹ بھرنے کی کوشش کرے، خود تکلیفیں اٹھا کر اوروں کو راحت و آرام پہونچائے، جو ایثار و قربانی کے پاکیزہ جذبہ سے کام کرے، جہاں خود غرضی نہیں بلکہ ایثار و بے لوثی پائی جائے۔

اسلامیت معاشرت میں ایک دوسرے کے

حقوق کا لحاظ ملاحظہ، بھائی بہن، والدین و اقرباء، پڑوسی وہمسایہ یہاں تک کہ راہگیر کے حقوق کی ادائیگی پر زور دے کر ایک مثالی انسانی معاشرہ کی تشکیل پر زور دیتا ہے، اسلام ایک ایسا معاشرہ چاہتا ہے جہاں آپس میں حسد، جلن، بغض وکینہ، لڑائی، فتنہ وفساد نہ ہو، جہاں لالچ وطمع کے جال میں پھنس کر کسی کی حق تلفی نہ ہو، جہاں عفت و پاکدامنی کا خیال کیا جائے، مردوعورت دونوں اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور شرمگاہوں کی حفاظت کریں، انسان شتر بے مہار نہیں بلکہ اپنے کو جوابدہ بنا کر زندگی گزارے۔

اسلامیت کا مطلب معاشی اور تجارتی زندگی میں سب کے لئے مواقع کی تلاش اور اس کی فراہمی ہے، پورا پورا ناپنا اور تولنا، لوگوں کو ان کے مکمل حقوق کی ادائیگی، لین دین میں شفافیت ہے، ملاوٹ سے گریز کرنا ہے، قرآن کہتا ہے: "وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ" ملاوٹ (Aduteration) کو حق کی ادائی میں کمی اور زمین میں فساد کا ذریعہ بتایا اور ببانگ دہل کہا کہ ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لئے ہلاکت و بربادی ہے ان کے لئے جو کوئی چیز لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب خود کوئی چیز وزن کرتے ہیں تو ناپ وتول میں کمی کرتے ہیں۔

جب قرآن اعلان کرتا ہے کہ ہم نے سارے انسانوں کو برابر پیدا کیا، دولت پیدا کرنے کے مواقع اور ذرائع سب کے لئے ہیں اور فرمایا **وجعلنا لکم فیھا معایش**، تو دولت کے اسباب و ذرائع پر محض چند لوگوں کی اجارہ داری کیوں؟ اسی طرح اسلام احتکار (ذخیرہ اندوزی) سے منع کرتا ہے، قرآن تجارت کی رغبت دیتا ہے، انسان کو بروبحر کے سارے اسباب و ذرائع کا مالک بتاتا ہے تاکہ سب اپنے اپنے حوصلہ کے مطابق کمائیں اور روزی کے اسباب تلاش کریں، روزی خوب خوب کمائیں اور کمائے ہوئے مال میں جو اصلاً اللہ کا مال ہے، غریبوں مسکینوں ۔ بے یار و مددگار، مسافر اور قرض میں ڈوبے ہوئے لوگ، اقرباء رشتہ دار سب کے حق کا لحاظ کریں، کھائیں پئیں، کھلائیں پلائیں اور اسراف وفضول خرچی سے بچیں، اسلام نہ کمیونزم کا قائل ہے نہ سوشلزم کا، اسلام کا اپنا معاشی نظام ہے جو عادلانہ نظام کے ساتھ ساتھ دولت اور ذرائع دولت پر محنت اور جفاکشی کی بنیاد پر حوصلہ مند لوگوں کو مواقع فراہم کرتا ہے، اس میں کالوں گوروں، امیر و غریب چھوٹے بڑے کسی کی کئی قید نہیں، ہر ایک کو دولت کی پیداوار، تبادلہ اور تقسیم کے ذرائع تک پہنچنے کا برابر حق ہے۔

۞۞۞

داعی کی سیرت اور حسن اخلاق

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

دعوت کا کام مسلمانوں کا خصوصی فریضہ قرار دیا گیا ہے، اور اس کو اسلامی زندگی کے قیام اور اس کی اثر پذیری کا ذریعہ بنایا گیا ہے، چنانچہ دعوتِ اسلامی کے عمل کو جتنی حکمت اور مخلصانہ جذبہ سے انجام دیا گیا، اسی قدر اسلامی زندگی کو مقبولیت اور کامیابی حاصل ہوئی، ہم کو مسلمانوں کی تاریخ میں اس کی واضح مثالیں ملتی ہیں، آغاز اسلام کے مکی دور میں جس عزیمت اور اخلاص سے یہ کام لیا گیا، اسی کے لحاظ سے مسلمانوں کو آگے کے لیے طاقت وعزت حاصل ہوئی۔

اسلام میں دعوت کے کام میں جبر اور زور دستی سے پرہیز کی تلقین کی گئی ہے، اور نصیحت وترغیب کے طریقوں کو اپنانے پر زور دیا گیا ہے، اور اس کے ساتھ خود داعی کی حسن سیرت واخلاق کی اہمیت بتائی گئی ہے، اور تاریخ بتاتی ہے کہ اسلام کی مقبولیت اور اثر انگیزی میں داعی کی سیرت اور حسن اخلاق کا عملی اظہار اور مخاطب کی نفسیات کا لحاظ مؤثر عامل رہا ہے، بعض وقت کسی ایک واقعہ سے پوری پوری جماعت راہِ ہدایت پا گئی ہے، تاریخ میں اس کے متعدد واقعات ہیں، صلح حدیبیہ کے وقت سے دو سال تک جو آپس میں ملاقات اور میل جول کا موقع حاصل ہوا، اس میں غیر معمولی طریقہ سے دعوت کے کام کو کامیابی ملی، اس کی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ غیروں کو مسلمانوں اور ان کے درمیان ملاقات ومعاملات کے ذریعہ مسلمانوں کے اخلاق وحسن سیرت اور انسانیت نوازی سے واقف ہونے کا موقع ملا، اور ان کو اسلام اور مسلمانوں کے سلسلہ میں جو غلط فہمیاں تھی، وہ دور ہوئیں۔

۞۞۞

محاسنِ اسلام

مایوسی - ایک خطرناک مرض

ڈاکٹر عبید الرحمٰن ندوی (استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء)

اسلام ہمیشہ ترقی اور کامیابی حاصل کرنے کی ترغیب دیتا ہے اور مایوسی و نا امیدی کو سختی سے ناپسند کرتا ہے۔اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا، إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا (بے شک، ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ بے شک، ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔)

یہ دونوں آیتیں واضح طور پر ہمیں سبق دیتی ہیں کہ اس دنیا میں ہمیں بہت سی ناکامیوں، رکاوٹوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔لیکن ہمیں کبھی ہمت نہیں ہارنی چاہیے اور نہ ہی مایوس ہونا چاہیے کیونکہ اللہ ہر مشکل کے بعد آسانی پیدا کرتا ہے اور مسائل کا حل فراہم کرتا ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی ان دونوں آیتوں کی تشرح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ یہاں اس پہلو پر بھی نظر رہے کہ ایک ہی بات دو مرتبہ فرمائی گئی ہے۔یہ تکرار محض تاکید کے لئے نہیں جیسا کہ عام طور پر لوگوں نے سمجھا ہے ۔بلکہ اس سے مقصود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ یہ عسر اور یسر دونوں اس دنیا میں لازم ملزوم ہیں۔ایک گھاٹی کسی نے پار کر لی تو یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ بس اب کسی نئی گھاٹی سے اس کو سابقہ نہیں پیش آنا ہے بلکہ دوسری اور تیسری گھاٹی بھی آسکتی ہے۔چاہیے کہ ان کو عبور کرنے کا حوصلہ بھی قائم رکھے۔زندگی مسلسل جدوجہد سے عبارت ہے۔اس جہاں میں ہر مسافر کو نشیب وفراز سے سابقہ پیش آتا ہے اور ان سے گزرنے کے بعد ہی کوئی رہرو منزل مقصود پر پہنچتا ہے۔(تدبر قرآن)

بدقسمتی سے آج مسلم امت اپنی تاریخ کے ایک نہایت نازک دور سے گزر رہی ہے۔مسلمان ذلت، محکومی اور بے بسی کی حالت میں ہیں۔وہ کمزور اور غیر یقینی صورتحال کا شکار ہیں، مسلم حکومتیں یا تو مغرب زدہ حکمرانوں کے زیرِ اثر ہیں یا موروثی حکمرانوں کے ہاتھ میں ہیں، جو عالمی طاقتوں کے ذریعے کنٹرول کئے جا رہے ہیں، ان حکمرانوں نے اسلامی تعلیمات اور ثقافت کے احیا کو دبانے کی کوشش کی ہے، جس کی وجہ سے آج امت مسلمہ اندرونی طور پر بکھر رہی ہے۔

آج مسلمانوں کے درمیان قومیت، زبان، فقہ کے اختلافات اور نسل پرستی کی بنیاد پر شدید اختلافات پائے جاتے ہیں۔اس صورتحال کو دیکھ کر لوگ مایوس ہو جاتے ہیں اور ایسی حکمت عملی اپنانے لگتے ہیں جو غیر مؤثر ثابت ہوتی ہیں اور بعض اوقات اسلامی تعلیمات کے بھی خلاف ہوتی ہیں۔لیکن حالات کے الٹ پھیر اور زمانہ کی گردشوں سے مایوس نہیں ہونا چاہئے کیونکہ مایوسی ایک نہایت خطرناک بیماری ہے، یہ ایک کینسر کی مانند ہے جو جسم کے خلیوں کو ختم کر دیتا ہے، لیکن ہم مسلمان، جو اللہ اور اس کی رحمت پر ایمان رکھتے ہیں، ہم کس طرح مایوس ہو سکتے ہیں؟ اس مایوسی اور نا امیدی کے چکر سے نکلنے کے لیے ہمیں علم، بصیرت، ہمت اور عزم کی ضرورت ہے۔

بلاشبہ، امت مسلمہ کی موجودہ صورتحال نہایت سنگین اور تکلیف دہ ہے، مگر ہمیں امید رکھنی چاہیے اور اللہ کی ذات پر مکمل بھروسہ اور اعتماد رکھنا چاہئے صرف وہی لوگ اللہ کی رحمت سے مایوس ہوتے ہیں جو اس پر ایمان نہیں رکھتے۔اگرچہ ہماری امت کی موجودہ صورتحال نہایت خراب ہے، ہمیں پھر بھی بہتری کی امید رکھنی چاہیے۔لیکن امید رکھنے کا مطلب یہ نہیں کہ ہم حقیقت سے آنکھیں بند کر لیں یا خود کو دھوکے میں رکھیں، ہمیں محنت کرنی چاہئے اور یہ امید رکھنی چاہیے کہ ہماری کوششوں سے معاشرے میں مثبت تبدیلی آئے۔جس طرح ایک بہت ہی مدھم روشنی بھی اندھیرے میں راستہ دکھا سکتی ہے، اسی طرح ہماری محنت اور امید بھی امت مسلمہ کی بہتری کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

ہمیں نبی کریم ﷺ کی اس مثال سے سیکھنا چاہیے۔جب آپ ﷺ طائف سے زخمی ہو کر واپس آئے تو آپ ﷺ نے فرمایا:''میں مایوس نہیں ہوں۔ایک نئی نسل آئے گی جو اللہ کی عبادت کرے گی۔'' اگر نبی کریم ﷺ اس امید پر دعا کر سکتے تھے کہ ابو جہل اور عمر جیسے دشمنانِ اسلام مسلمان ہو سکتے ہیں، تو ہمیں بھی یہ امید رکھنی چاہیے کہ آج کے دشمنانِ اسلام بھی ایمان کی دولت سے سرفراز ہو سکتے ہیں۔اگر ہلاکو خان کے خاندان کے لوگ مسلمان ہو سکتے ہیں، تو ہمیں کیوں مایوس ہونا چاہیے؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ جو آج ہمیں ستا رہے ہیں وہ کل ایمان لے آئیں؟

خلاصہ کلام یہ ہے کہ شیطان ہمیشہ کوشش کرتا ہے کہ وہ ہمیں مایوسی اور نا امیدی میں مبتلا کر دے تا کہ ہم راہ راست سے ہٹ جائیں، اس لئے ضروری ہے کہ ہم شیطان کے دھوکے اور فریب کو سمجھیں اور اسلامی تعلیمات پر مکمل یقین اور بھروسے کے ساتھ عمل کریں۔

تعلیم وتربیت

نسلوں کی جدید تقسیم اور والدین کی ذمہ داریاں

مولانا مطیع الرحمٰن عوف ندوی (ناظر معہد سکروری، ندوۃ العلماء)

حالیہ دنوں نیپال میں عوامی تحریک کے ذریعہ حکومت کی تبدیلی اور حکمرانوں کے مکانات کو نذر آتش کرنے، ان کو مارنے پیٹنے اور اس دُنیا سے رخصت کرنے کے جو واقعات رونما ہوئے اس میں کثرت سے جن ذی جو ''جنریشن زیڈ'' کا مخفف ہے، میڈیا میں پہلی بار سامنے آیا، یہ نوجوانوں کی وہ ٹیم ہے جو 1997 کے بعد وجود پذیر ہوئی، اور جو جدید ذرائع و وسائل اور ہائی ٹیک ٹیکنولوجی کے زمانہ میں پیدا ہوئی، دراصل جدید دور میں جنریشن کی تقسیم تین ادوار میں کی گئی ہے، اس میں سے ایک جنریشن زیڈ ہے، جو 1997 سے 2012/15 کے درمیان برپا ہوئی، یہ پہلی نسل ہے جس نے آنکھ کھولتے ہی جدید ٹکنولوجی کا مشاہدہ کیا، مثلاً اس نے انٹرنیٹ، اسمارٹ فون، سوشل میڈیا اور ڈیجیٹل ٹکنولوجی کو اپنی روز مرہ زندگی میں پایا، اسے ڈیجیٹل نیٹیوز (Digital Natives) کہا جاتا ہے، اس نسل کی پرداخت میں فیس بک، انسٹا گرام، یوٹیوب، ٹک ٹاک وغیرہ کا اہم کردار ہے، انہوں نے ان وسائل کا اپنی روزمرہ کی زندگی میں مشاہدہ کیا اور کم عمری سے ان کو برتنا بھی شروع کردیا، انہوں نے جو دور پایا وہ گذشتہ ادوار سے مختلف ہے، یہ نسل عملی اور کریٹیو شعبوں کی طرف زیادہ رجحان رکھتی ہے، روایتی ملازمتوں کے ساتھ ساتھ آن لائن بزنس، نیٹ ورک مارکیٹنگ، لاسنگ پر زیادہ اعتماد کرتی ہے۔

یہ نسل گذشتہ نسلوں کے مقابلہ میں زیادہ حساس اور تحریکی ہے، اس لئے کہ اس نے آنکھ کھولتے ہی دنیا کے ان حالات کا مشاہدہ کیا جس سے پہلے کے نوجوان وسائل نہ ہونے کی وجہ سے محروم رہتے تھے، ظلم وجور، انارکی، بے اعتدالی و ناانصافی، بے روزگاری، غربت، بھکمری، مہنگائی، دنیا میں پناہ گزینوں کی کثرت، سماج میں موجود عدم مساوات اور کمزور طبقہ کے استحصال نے ان کے اندر حساسیت کو جلا بخشی، اس کا اندازہ سوشل میڈیا پر ان کے تبصروں اور تحریروں سے لگایا جاسکتا ہے، اس نسل کا اک امتیاز یہ بھی ہے کہ یہ مختصر جملوں، ایموجیز، میمز اور ویڈیوز کے ذریعہ اپنی آراء کو پیش کرنے کو ترجیح دیتی ہے، طول طویل لکچر اور حشو وزوائد سے پُر گفتگو ناپسند کرتی ہے، پرتکلف گفتگو اور روایتی پروپیگنڈہ کے بجائے مختصر گوئی اور شارٹ کٹ راستہ کو زیادہ پسند کرتی ہے، مزاج کے خلاف ہونے والے امور سے جلد متاثر ہوتی ہے، اور مزاج میں نرمی، مظلوموں سے ہمدردی، اور عالمی سیاست پر مثبت سوچ کی حامل ہے، تمام تر خوبیوں کے ساتھ بے راہ روی کے امکان سے انکار ممکن نہیں ہے، لیکن یہ تعداد کم ہے اور اپنے بہتر کیریئر اور تابناک مستقبل کے تئیں سنجیدہ پائی جاتی ہے، اور عالمی سطح پر مقابلہ جاتی امتحانات نے ان کی زندگی میں محنت اور جفاکشی کو فروغ دیا ہے۔

جدید نسل کی دوسری قسم کا تعلق دو ہزار پچیس (2025) سے قبل جنم لینے والوں سے ہے، اس کو جنریشن الفا (Generation Alpha) کہا جاتا ہے، موجودہ وقت میں پیدا ہو چکے یا ہونے والے بچے جنریشن الفا کہے جاتے ہیں، یہ وہ نسل ہے جنہوں نے دنیا میں آنکھ کھولتے ہی اسمارٹ فون، ٹیبلٹ، اسمارٹ ٹی وی اور AI (مصنوعی ذہانت) کا مشاہدہ کیا ہے، ان کے لئے AI روبوٹکس میٹاورس (Metaverse) اور ورچول ریئلیٹی عام سی بات ہوگی، اس نسل کی تعلیم کا زیادہ انحصار، ای لرننگ (آن لائن کلاسز) انٹر ایکٹیو ایپس اور ڈیجیٹل پلیٹ فارم سے منسلک ہوگا، جس کو رفتہ رفتہ لاک ڈاؤن اور کووڈ 19 نے فروغ دیا اور پھر لاک ڈاؤن ختم ہونے کے بعد اس کی حیثیت ایک انسانی ضرورت جیسی کی ہوگئی، لاک ڈاؤن سے قبل جن ہاتھوں میں موبائل نہیں تھا، آن لائن کلاسز نے ان کے لئے ملٹی میڈیا کو لازم قرار دیا، حتیٰ کہ دینی مدارس میں بھی آن لائن تعلیم کا نظام نافذ ہوا، دارالعلوم ندوۃ العلماء نے بغیر کسی پس وپیش کے آن لائن نظام تعلیم جاری کیا اور اس طرح لاک ڈاؤن کی وجہ سے طلبہ نے اپنے گھر رہ کر تعلیم حاصل کی، اس کے مقابلہ میں ہندوستان کے بعض قدیم ادارے پس وپیش میں رہے، اور آن لائن تعلیم کے عدم جواز کی مجبوریوں کے پیش نظر انہوں نے آن لائن نظام شروع کیا، لیکن آج صورت حال یہ ہے کہ اب کوئی دینی ادارہ موبائل پر کنٹرول کا دعویٰ نہیں کرسکتا، ہاں اس کے بے جا استعمال اور لایعنی پروگرام کو کوئی بھی ادارہ جواز تو نہیں فراہم کرسکتا لیکن حالات نے اس پر کنٹرول مشکل کردیا ہے، ابھی حال ہی میں مجھے ایک قدیم اور معروف دینی درسگاہ کی زیارت کی سعادت ملی، وہاں امتحان چل رہے تھے، میں نے دیکھا کہ بعض طلبہ موبائل میں PDF سے مطالعہ کررہے ہیں اور

امتحان کی تیاری میں مصروف ہیں، مجھے تعجب ہوا تو میں نے ان سے دریافت کیا کہ کیا طلبہ کے لئے موبائل کا استعمال ممنوع نہیں ہے؟ میرے سوال سے صرف نظر ایک طالب علم نے برجستہ جواب دیا کہ اس کے بغیر تو ہم کچھ کر ہی نہیں سکتے، پھر انہوں نے بتایا کہ نیچے کے درجوں کے طلبہ کے لئے ممانعت ہے، واضح رہے کہ یہ طلبہ اختصاص کے تھے، جب کہ اسی ادارہ کے ایک ذمہ دار نے لاک ڈاون میں آن لائن تعلیم کیسخت مخالفت کی تھی، اس لئے ایسے دور میں جب ایک بچہ آنکھ کھولتے ہی ایک نئی دنیا کا مشاہدہ کرتا ہے تو پھر عمر کے کسی مرحلہ میں اس کو اس سے باز رکھنا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن معلوم ہوتا ہے۔

یہ نسل جسے جنریشن الفا کا نام دیا گیا، جن کے پروان چڑھتے ہوئے دنیا اتنی مختصر ہوچکی ہوگی کہ عالمی سطح پر ان کے لئے دوستی کرنا اور اپنے فالوورس پیدا کرنا بہت آسان ہوجائے گا، یہ بچے سوشل میڈیا کے ساتھ ساتھ ورچول ورلڈ (Virtual Word) میں بھی تعلقات بنانے میں سبقت لے جائیں گے، نیز یہ بچے انتہائی حساس، محرک، ٹیکنالوجی پر انحصار کرنے والے، گلوبل ویلوز (ماحول، دوستی، مساوات، انسانیت وانصاف) پر اعتماد کرنے والے ہوں گے، اور گذشتہ نسلوں کے مقابلہ میں ان کی ذہانت ومتانت دوچند ہوگی۔

جنریشن کی ایک اور قسم ہے، جنریشن وائی، یہ 1981 سے 1996 کے درمیان پیدا ہونے والوں کی نسل ہے، جو اپنی عمر کی تین یا چار دہائی مکمل کرچکی ہے، انہوں نے بہت دیر سے موبائل اور انٹرنیٹ کا مشاہدہ کیا، بہت ممکن ہے کہ فلموں میں موبائل یا اس جیسے لاسلکی آلات دیکھے ہوں، لیکن باقاعدہ طور پر اپنی عمر کے پندرہ بیس سال گزرنے کے بعد پہلے سادہ موبائل دیکھا، اس کے بعد انٹرنیٹ کی محدود سہولت سے سابقہ رہا اور پھر انہوں نے ڈیجیٹل دنیا کا مشاہدہ کیا، کیریئر کے ساتھ ساتھ ان کا طرز زندگی پر بھی زور ہے، اور ان میں بعض کو موبائل کے فنکشن اور آپشن کو سمجھنے میں بھی کافی وقت لگا، اس کے علاوہ بھی جنریشن کی جو تقسیم ہے اس میں بیبی بومیز (Baby Boomess) جن کا دور ولادت 1946 سے 1964 تک ہے، ان میں بہ کثرت نے موبائل نہیں دیکھا، ٹیلی فون، ٹی وی اور اسکرین کو خال خال افراد نے دیکھا، لیکن اس کے بعد جنم لینے والے جنریشن ایکس (Generation X) کے جو بچے 1965 سے 1980 کے درمیان پیدا ہوئے، ان کی زندگی گذشتہ ادوار سے مختلف ہے، لیکن آنے والی نسلوں سے یہ بھی بہت پیچھے ہیں، انہوں نے رنگین ٹی وی، ٹیپ رکارڈ، اور اپنی جوانی میں ابتدائی کمپیوٹر کو دیکھا یا سنا، یہ نسل عملی، خودمختار اور اعتدال وتوازن کی حامل ہے۔

موجودہ وقت میں وہ جنریشن کے جو تربیت کے مراحل سے گزر رہی ہے وہ جنریشن زیڈ یا جن زی ہے، موبائل گویا اس کے جسم کا ایک عضو یا حصہ ہے جس کے بغیر زندگی گزارنے کا اس کے نزدیک تصور ہی نہیں ہے، اس کے لئے وہ کسی بھی سرکشی، نافرمانی یا عداوت تک جانے کو تیار ہے، اس نسل کی تربیت بڑے تجربہ، ہوشمندی اور صبر واستقامت کی طالب ہے، جذباتیت، حساسیت اور جلد بازی کے نتیجہ میں کف افسوس ملنے کے علاوہ کچھ حاصل ہونے والا نہیں ہے، اگر علم وتجربہ کی کسوٹی پر دیکھا جائے تو اس نسل کے لئے یہ عنصر سب سے زیادہ سہل الحصول ہے اور کم عمر میں زیادہ علم اور تجربہ حاصل کرنے کے مواقع فراہم ہیں، ان کی دنیا سوشل میڈیا کی دنیا ہے، جس میں حقائق کو پرکھنا بہت مشکل ہوتا ہے، شارٹ ویڈیوز، میمز اور کلپ سے وہ ہر طرح کی بسہولت معلومات حاصل کرلیتے ہیں، لیکن اس میں رطب ویابس، صحیح وغلط کی تمیز کرنا ان کے لئے بہت مشکل کام ہے، کیونکہ دین کی روح اور اس کے مبادی سے ناواقف حضرات یوٹیوب پر تمام دینی افکار وعقائد اور مسائل میں محاضرات دیتے نظر آتے ہیں جن سے اس نسل کی ذہن سازی ہوتی ہے، اور پھر اشکالات کرنے والوں کے اشکال ان کے ذہن میں دین ومذہب کے سلسلہ میں شکوک وشبہات فروغ دیتے ہیں، اس لئے لازم ہے کہ ان کی علمی، فکری وعملی تربیت کے لئے والدین ان کو وقت دیں، ان کو دین کی باتیں سکھائیں، عقائد و معاملات سے آگاہ کریں، اخلاق وعبادات سے روشناس کرائیں، اور ان کو صحیح اور غلط کی تمیز کرنے کے ہنر سکھائیں۔ ورنہ بے راہ روؤں کا لشکر ان کے ایمان وعقیدہ کو نہ صرف سبوتاژ کرے گا بلکہ اس کے بنیادی ستونوں کو نیلام کر ڈالے گا، اس نسل کی دینی تعلیم اور تربیت کی خصوصی فکر کریں، اس کا بہترین نظم کریں، براہ راست مراجع اور اصول سے استفادہ و افادہ کے لائق بنائیں، ان کو نیک اور صالح افراد کی صحبت اور ماحول فراہم کریں، ان کے اشکالات کو بغور سنیں اور ان کا تشفی بخش جواب فراہم کریں، ورنہ اس نسل کو بے راہ روی و گمراہی سے کوئی طاقت روک نہ سکے گی، وہیں اگر ان کی تربیت کی فکر کی گئی اور اسلامی اخلاق ومعاملات کا خوگر اور اس پرکار بند رہنے والا بنایا گیا، اسلامی ماحول میں ان کو ڈھالا گیا، تو ان سے بہتر نسل بھی مشکل سے ملے گی۔ **واللہ فی عون العبد ما کان العبد فی عون أخیه۔**

❁❁❁

راہِ نجات

اسلام نے اس دنیا کو نیا شعور دیا

مولانا محمد ناصر ندوی (پرتاپ گڑھ)

اسلام نے جب اپنی کرنیں اس کائنات کے افق پر بکھیرنی شروع کیں تو دنیا تاریکیوں میں بھٹک رہی تھی۔ انسان اپنی عظمت سے بے خبر، اپنے مقصد سے غافل اور اپنی حقیقت سے ناواقف تھا۔ کبھی وہ بتوں کے سامنے جھک کر اپنے شرف کو پامال کرتا، کبھی آسمان کے اجرام کو معبود بنا کر اپنی عقل کی رسوائی کا سامان کرتا، کبھی نسل و رنگ کی بنیاد پر اپنے ہی بھائی کو غلام بنا کر اس کی آزادی سلب کرتا، اور کبھی عورت کو باعثِ ننگ و عار سمجھ کر زندہ دفن کر دیتا۔ علم کا چراغ بجھ چکا تھا، جہالت کی دھند ہر سمت چھائی ہوئی تھی، طاقت ہی معیارِ حق تھی اور کمزور کا خون پانی سے بھی سستا سمجھا جاتا تھا۔ ایسے حالات میں اسلام آیا اور اس نے انسانیت کو نیا شعور دیا، نئی زندگی بخشی، اور ایک ایسی فکر عطا کی جس نے صدیوں کی غفلتوں سے آگاہ کیا، اور دنیا کو فکری بیداری، نئی روشنی اور مقامِ انسانیت کی بلندی عطا کی۔

اسلام نے سب سے پہلا شعور یہ دیا کہ انسان محض ایک حیوانِ ناطق نہیں بلکہ زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے۔ اسے یہ باور کرایا گیا کہ وہ خاک سے پیدا ہوا ضرور ہے لیکن اس کے اندر وہ نور رکھا گیا ہے جس کے سامنے ملائکہ نے سجدہ کیا۔ یہ شعور انسان کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس دلاتا ہے، اسے بتاتا ہے کہ اس کی زندگی کا مقصد صرف کھانا، پینا اور عیش کرنا نہیں بلکہ اللہ کی بندگی اور انسانیت کی خدمت ہے۔

یہی شعور ہے جو انسان کو حیوانی درجہ سے اٹھا کر ملائکہ کے مقام سے اوپر پہنچاتا ہے۔ اسلام نے توحید خالص کا شعور دیا۔ یہ پیغام دیا کہ کائنات کا خالق و مالک ایک ہے اور اسی کے آگے جھکنا انسان کی اصل آزادی ہے۔

جب انسان نے اس پیغام کو سمجھا تو وہ بتوں کی غلامی سے آزاد ہوا، اسے جھوٹے خداؤں سے نجات ملی اور دل سے یہ خوف مٹ گیا کہ کوئی طاقت اللہ کے حکم کے بغیر کچھ کرسکتی ہے۔

یہی شعور انسان کے tاندر خودداری پیدا کرتا ہے اور اسے ہر غیر اللہ کے سامنے جھکنے سے روکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک بے سہارا غلام بھی جب کلمہ پڑھ لیتا تھا تو وہ فرعونیت کے ایوانوں کو لرزا دیتا تھا۔

اسلام نے عدل و انصاف کا شعور دیا، اس نے بتایا کہ انصاف طاقتور اور کمزور کے بیچ فرق نہیں کرتا، انصاف کے ترازو میں قریش کا سردار اور حبشہ کا غلام ایک ہی ہیں۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا کہ اگر میری بیٹی فاطمہ بھی چوری کرے تو میں اس پر بھی وہی سزا نافذ کروں گا جو کسی اور پر کی جاتی ہے۔

یہ وہ شعور تھا جس نے انسانیت کو بتایا کہ کسی قوم کی بقا تلوار سے نہیں بلکہ عدل سے ہوتی ہے، اور تاریخ نے دیکھا کہ اسلام کے زیرِ سایہ وہ انصاف قائم ہوا جس کی مثالیں آج بھی دنیا حیرت سے دہراتی ہے۔

اسلام نے علم کا شعور دیا۔ قرآن کی پہلی صدا ہی ''اقرأ'' تھی، گویا کہ انسانیت کو یہ بتایا گیا کہ علم ہی وہ کنجی ہے جس سے غلامی کے قفل ٹوٹتے ہیں، علم ہی وہ چراغ ہے جو تاریکیوں کو روشنی میں بدل دیتا ہے۔ اسلام نے قلم کو شمشیر سے بلند تر قرار دیا، عالم کو جاہل پر فوقیت دی اور جہالت کو تاریکی اور علم کو نور قرار دیا۔

یہی شعور تھا جس نے بعد کے زمانے میں ایسے مراکزِ علم قائم کیے جن سے ساری دنیا نے استفادہ کیا، بغداد کی درسگاہیں، اندلس کی لائبریریاں، بخارا و سمرقند کی علمی بزمیں اور دہلی و لکھنؤ کے مدارس اسی شعور کے آثار ہیں۔

اسلام نے اخوت و مساوات کا شعور دیا، یہ بتایا کہ انسان انسان کا بھائی ہے، کسی کو رنگ، نسل، زبان یا قومیت کی بنیاد پر برتر یا کمتر نہیں کہا جاسکتا، حج کے اجتماع نے اس مساوات کو زندہ تصویر بنا دیا، جہاں ایک ہی لباس میں کالے اور گورے، عربی اور عجمی ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے ہیں۔ پیغمبر اسلام محمد ﷺ نے اعلان کیا کہ عربی کو عجمی پر اور گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں، فضیلت صرف تقویٰ کی بنیاد پر ہے۔ یہ شعور وہ انقلابی پیغام تھا جس نے صدیوں کے امتیازات اور تعصّبات کو مٹا دیا، اسلام نے عورت کو عزت

دی۔ جس معاشرے میں عورت کو بوجھ سمجھا جاتا تھا، پیغمبر اسلام نے کہا کہ جنت ماں کے قدموں تلے ہے۔ جس دور میں بیٹی کو زندہ دفن کیا جاتا تھا، اسلام نے کہا کہ بیٹیوں کی پرورش جنت کی ضمانت ہے۔ جس ماحول میں عورت کو صرف بازار کی زینت سمجھا جاتا تھا، اسلام نے اسے گھر کی ملکہ بنادیا، وراثت میں حصہ دیا اور اسے انسانیت کا وہ مقام عطا کیا جو کسی مذہب نے نہ دیا تھا۔

یہ وہ شعور ہے جس نے انسانیت کو زندگی کی عزت اور بقاء عطا کی، اسلام نے دنیا کو یہ بھی بتایا کہ زندگی محض دنیاوی آسائشوں کا نام نہیں۔ یہ ایک امتحان ہے، ایک سفر ہے، ایک ذمہ داری ہے۔ انسان کے اعمال کا حساب ہوگا اور ہر ایک کو اپنی کوششوں کا بدلہ ملے گا۔

یہ شعور انسان کو غفلت سے نکالتا ہے، اس کے دل میں خوفِ خدا پیدا کرتا ہے، اس کے اندر جواب دہی کا احساس بیدار کرتا ہے۔ جب یہ شعور زندہ ہوتا ہے تو حکمران اپنی رعایا کے حقوق ادا کرتے ہیں، تاجر اپنے سودے میں خیانت نہیں کرتے، اور عام انسان اپنے اعمال میں خدا کو یاد رکھتے ہیں۔

اسلام نے خدمتِ انسانیت کا شعور دیا۔ بھوکے کو کھلانا، یتیم کا سہارا بننا، غریب کی مدد کرنا، بیمار کی عیادت کرنا، یہ سب اسلام کے شعور کے مظاہر ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ سب سے بہترین انسان وہ ہے جو دوسروں کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچائے۔ یہی وہ شعور تھا جس نے اسلامی معاشرے کو ایسا نظام دیا، جس میں ہر فرد کو اپنی جگہ اور اپنا حق مل سکا۔

یہ وہ انقلابی شعور ہیں جو اسلام نے دنیا کو عطا کیے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک اجڑی ہوئی قوم جو صحرا کی ریت پر بکھری ہوئی ریت کے ذروں کی طرح تھی، جب ایمان کے نور سے منور ہوئی تو دنیا کی پیشوا اور رہنما بن گئی۔ ان کے قدم جہاں پڑے وہاں علم کی روشنی پھیلی، انصاف کے چراغ جلے، اخوت کے رشتے استوار ہوئے اور دلوں کو خدا کی یاد نے سکون بخشا۔ یہ اسلام کے عطا کردہ شعور کا کرشمہ تھا جس نے تاریخ کا دھارا موڑ دیا اور دنیا کو ایک نئی سمت عطا کی۔

آج کی انسانیت اگر اپنی بھٹکی ہوئی راہوں سے واپس پلٹ کر اسلام کے پیغام کو اپنا لے تو اندھیروں کے یہ بادل چھٹ جائیں، ظلم کے یہ پہاڑ ڈھیر ہوجائیں، اور انسانیت پھر سے امن و انصاف اور اخوت کے آسمان تلے سر اٹھا کر جینے کے قابل ہوجائے۔

اسلام کا دیا ہوا یہ شعور وقت اور حالات کا پابند نہیں بلکہ ہر دور کے لئے ہے، ہر نسل کے لئے ہے، ہر تہذیب کے لئے ہے۔ جو بھی اس شعور کو اپنا لے گا وہ کامیاب ہوگا اور جو اس سے غافل ہوگا وہ نقصان اٹھائے گا۔ اسلام کا یہ شعور صدیوں سے انسانیت کی رہنمائی کرتا آیا ہے، اس نے پاکیزہ تہذیب کو جنم دیا، سائنس و فلسفہ کو جلا بخشی، ادب و فن کو نکھارا، سیاست کو عدل کا پابند بنایا، اور روحانیت کو زندگی کا مرکز قرار دیا۔

اگر آج انسانیت اپنی بھٹکی ہوئی راہوں کو چھوڑ کر اسلام کے عطا کردہ شعور کو اپنا لے، تو دنیا ظلم کے اندھیروں سے نکل کر انصاف و امن کے نور میں نہا جائے، یہی شعور آج بھی انسانیت کی اصل نجات کا واحد راستہ ہے۔

امراضِ باطنی کی سنگینی

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

”ہم وباؤں سے ڈرتے ہیں، امراض سے گھبراتے ہیں، بلاؤں کی دہشت ہمارے دلوں میں سمائی ہوئی ہے، اور اس کے لیے ہر طرح کی احتیاطی تدبیریں عمل میں لاتے ہیں، یہاں تک کہ اگر کوئی کہہ دے کہ یہاں کالرا کا ایک کیس ہوگیا ہے تو پورے شہر میں دہشت پھیل جاتی ہے، ہر شخص پر خوف مسلط ہوجاتا ہے، اور یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس وبا کا سب سے پہلا شکار وہی ہوگا، لیکن اخلاقی امراض، یہ غلط اخلاق و عادات، جن کو اللہ اور رسول ناپسند کرتے ہیں، یہ مادہ پرستی، شہوت پرستی، ہر جگہ قوت کے سامنے سرنگوں ہوجانا، خواہشات کی بے قید اطاعت، جذبات کی رو میں بہہ جانا، لہو و لعب میں انہماک، رقص و سرود، ذہنی تسکین اور آرام طلبی و عیش کوشی کے دیگر وسائل میں حد سے بڑھی ہوئی دلچسپی، قیادتوں اور نعروں کی اندھی تقلید، حقائق سے چشم پوشی، بار بار کے تجربات سے عبرت نہ حاصل کرنا، امیدوں اور آرزوؤں کی بے لگامی، انسانوں کا حد سے بڑھا ہوا احترام، سیاسی اور غیر سیاسی لیڈروں اور رہنماؤں کی تقدیس اور ان کے بارے میں غلط فہمیوں اور لغزشوں سے معصومیت کا اعتقاد، یہ امراض ہمارے انجام اور ہمارے معاشرہ کے لیے ہزاروں دشمنوں اور دشمن کے ہزاروں لشکروں سے کہیں زیادہ خطرناک، کہیں زیادہ مہلک اور کہیں زیادہ تشویشناک ہیں۔“

(عالم عربی کا المیہ، ص: ۱۱۵)

اسوۂ حسنہ

نبی رحمتؐ کی ہمدردی وغم گساری

محمد زاہد حسین ندوی (استاذ مدرسہ خدیجۃ الکبریٰ للبنات-جمشید پور)

نبی کریم ﷺ کے زمانے میں کسی انسان کو کبھی کوئی تکلیف پہنچی ہو، کسی کا کوئی جانی و مالی نقصان ہوا ہو، کسی گھرانے پر غم کا کوئی پہاڑ ٹوٹا ہو تو ایسا نہیں ہوا کہ نبی پاک ﷺ کا دست شفقت اس کے سر پر نہ رہا ہو اور آپ کے دامن عاطفت میں اس کو پناہ نہ ملی ہو۔ مکہ مکرمہ میں ایمان لانے کی پاداش میں ظلم وستم سہنے والے صحابہ، حضرت بلال، حضرت خباب، صہیب رومی، خبیب ابن عدی اور حضرت یاسر (رضی اللہ عنہم) کا گھرانہ جب دکھ درد سہتا تھا، کفار مکہ کی طرف سے اذیتوں کا شکار ہوتا تھا تو ان کی تکلیف دیکھ کر نبی کریم ﷺ کا بھی دل دکھتا تھا، آپ ﷺ حضرت یاسر کے گھر والوں پر ظلم کی واردات دیکھ کر تڑپ اٹھتے اور انھیں تسلی دیتے ہوئے فرماتے : "صبراً یا آل یاسر! فان موعدکم الجنة" یاسر کے گھر والو! صبر سے کام لو جنت تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ آپ ﷺ کی اس تڑپ وکلفت کی قرآن مجید نے یوں گواہی دی ہے:" لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ "(توبہ:۱۲۸) (لوگو!) تمہارے پاس ایک ایسا رسول آیا ہے جو تمہیں میں سے ہے، جس کو تمہاری ہر تکلیف بہت گراں معلوم ہوتی ہے، جسے تمہاری بھلائی کی دھن لگی ہوئی ہے، جو مؤمنوں کے لیے انتہائی شفیق، نہایت مہربان ہے)۔

یتیموں کے ساتھ ہمدردی اور ان کی کفالت کے معاملے کو لے لیجیے تو آپ جیسا یتیموں کا والی اور غلاموں کا ملجا کوئی نہ ملے گا؛ جب غزوۂ مؤتہ میں آپ ﷺ کے چچیرے بھائی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بڑے بھائی حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوئی تو آپ ﷺ نے حضرت جعفرؓ کے بچوں کو اپنے پاس بلایا اور بچوں کی ماں حضرت اسماء بنت عمیس سے فرمایا: تمہیں ان کی کفالت کی فکر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں، محمد آج سے دنیا و آخرت میں ان کا سرپرست اور والی ہے۔

مدینہ منورہ تشریف آوری کے بعد جب آپ ﷺ آپس میں دو متحارب قبیلوں اوس وخزرج کے نبی ہونے کے ساتھ ساتھ پوری ریاست مدینہ کے حاکم اعلیٰ بھی ہو گئے تو آپ کی اس صفت ہمدردی وغم خواری میں مزید اضافہ ہوتا چلا گیا، آپ ﷺ نے مکہ کے لٹے پٹے مہاجرین اور انصار کے درمیان مؤاخات کرائی اور ان میں بھائی چارہ کا ایسا رشتہ قائم کرایا کہ وہ حقیقی بھائی کی طرح ہو گئے۔

آپ ﷺ کی اسی ہمدردی وکرم نوازی کا نتیجہ تھا کہ اہل مدینہ میں آپ کی ان صفات کو اپنے اندر اس طور پر جذب کر لیا کہ وہ خود ایثار وہمدردی کی ایک مثال بن گئے، اور دربار رسالت سے ان کو مستقل "انصار" (مدد کرنے والے) کا لقب حاصل ہوا، اور انھیں یہ امتیاز حاصل ہوا کہ اللہ کے لیے مدد ونصرت کرنے کے معاملے میں ان جیسے لوگ نہ پچھلی امتوں میں پیدا ہوئے اور نہ قیامت تک پیدا ہو سکتے ہیں۔

اہل مکہ نے آپ ﷺ پر اور آپ کے اصحاب پر طرح کے ظلم ڈھائے تھے، وہ آپ کی جان لینے کے فراق میں تھے، ان کی ستم رسانی ہی کی وجہ سے آپ ﷺ ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے تھے لیکن جب وہاں قحط پڑا تو رحمت دو جہاں ﷺ نے انسانی ہمدردی کی بنیاد پر ان کے لیے پانچ سو درہم کی مدد بھجوائی۔

ایک طرف ہمارے نبی رحمت ﷺ کا یہ اسوہ ہے اور دوسری طرف ہمارا رویہ! آج کے ہم کھاتے پیتے مسلمان، ایئر کنڈیشن مساجد میں نماز پڑھنے والے مسلمان، فکر دوراں میں الجھے اور فکر جاناں میں مبتلا مسلمان جنھیں کشاکش حیات اتنی فرصت ہی نہیں دیتی کہ اب اپنے غزہ کے بھائیوں کی طرف نظر غلط اٹھا کر ہی دیکھ لیں، شروع میں ماشاءاللہ بڑے زور وشور سے اظہار ہمدردی ہوا، اسرائیلی پروڈکٹس کا بائیکاٹ بھی ہوا، جو یقینا قابل ستائش ہے لیکن اب غزہ کے مؤمن بھائی بہنوں اور بچوں پر ظلم کی کوئی خبر بھی آتی ہے تو وہ ہمارے لیے ایک معمول کی چیز بن گئی ہے، اب وہاں کے المناک واقعات ہمارے دلوں کو نہیں تڑپاتے، ہماری آنکھوں سے کوئی قطرہ نہیں گرتا، ہماری دعاؤں میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا، قنوت نازلہ پڑھنے کے لیے بھی ہمیں کسی کے فتوی کا انتظار ہے، ایسا لگتا ہے کہ اب ہمارے خون میں کوئی حرارت، ایمان کی غیرت اور دینی حمیت باقی نہ رہی۔

تف ہے عرب حکمرانوں اور ان کی غلامانہ ذہنیت پر جو صرف مذمتی بیانات پر اکتفا کرتے ہیں اور شاد ہے مسلم دنیا کے وہ عوام کو جو بوتلوں میں اناج بھر بھر کے پانی کے دوش پہ اہل غزہ تک امداد پہنچانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

ایمان وتقویٰ

زبان کا درست استعمال

محمد جاوید اختر ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

دین اسلام کی سب سے جامع اور عمدہ خوبی ہے کہ وہ انسان کی ظاہری اور باطنی طہارت کا خواہاں ہے، قلب وذہن کی نظافت وصفائی کے لئے زبان اور اعضائے ظاہرہ کی پاکیزگی کا درس دیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ایمان وتقویٰ کی جڑیں جتنی گہری اور مضبوط ہوتی ہیں، اتنا ہی صاحب ایمان کی فکر واخلاق اور زبان وبیان شائستہ، عمدہ اور بلند ہوتے چلے جاتے ہیں، کتاب وسنت میں مختلف اسلوب وپیرائے کے ذریعے اہل اسلام کو تعلیم وتلقین کی گئی ہے کہ وہ اپنی ذات سے دوسرے مسلمان بھائی کو ایذا دینے سے بچیں، اخلاقی پستی، بدکلامی اور فحش بیانی جیسی مذموم عادات، دوسروں کی دل شکنی اور ایذا رسانی کا جس قدر ذریعہ بنتی ہیں، وہ محتاج بیان نہیں۔

قرآن مجید میں اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: ''بے حیائی کے پاس بھی مت جاؤ خواہ وہ علانیہ ہوں یا پوشیدہ''۔ [انعام:۱۵۱]

ایک حدیث میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ''مومن طعنہ دینے والا ہوتا ہے نہ لعنت کرنے والا، نہ بے حیائی اور بدکلامی کرنے والا''۔ [ترمذی] دوسری حدیث میں سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدزبانی وبے حیائی کی مذمت وقباحت یوں بیان فرمائی: ''بے حیائی جس کسی چیز میں بھی ہوتی ہے اسے عیب دار بنا دیتی ہے اور شرم وحیا کی صفت جس میں ہو وہ مزین، پسندیدہ اور خوبصورت ہوجاتی ہے''۔ [ترمذی]

خود ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی عادات، شمائل اور اخلاق کے حوالے سے کتب سیرت میں موجود ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہ تو طبعاً فحش گو تھے اور نہ بتکلف فحش بات فرماتے تھے، اسی طرح بازاروں میں چیخ وپکار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت ومزاج کا حصہ نہ تھا، اخلاق نبویؐ کی گواہی قرآن کریم یوں دیتا ہے: ''اگر تم سخت مزاج اور سخت دل والے ہوتے تو یہ (صحابہ کرامؓ) تمہارے آس پاس سے ہٹ کر تتر بتر ہوجاتے''۔ [آل عمران:۱۵۹] بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم برائی کا بدلہ اچھائی سے دیا کرتے اور عفو ودرگزر سے کام لیا کرتے۔

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ گندی، بے ہودہ اور اخلاق سے گری ہوئی زبان کے استعمال سے انسان میں ''نفاق'' کا مرض پیدا ہوجاتا ہے، ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے: ''چار چیزیں جس شخص میں ہوں گی وہ خالص اور پکا منافق ہے اور جس کے اندر ان میں سے کوئی ایک بیماری موجود ہو تو وہ نفاق کی ایک خصلت وعادت میں مبتلا ہے، یہاں تک کہ اسے چھوڑ دے وہ چار ناپسندیدہ چیزیں یہ ہیں: جب اس کے پاس امانت رکھوائی جائے تو خیانت کرے، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو وفا نہ کرے اور جب جھگڑا کرے تو گالی دے''۔

[مشکوٰۃ: ج۱/ص۱۷]

آج ہمارے رویوں میں ایمانی کمزوری اور عملی پستی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہم نے قرآن وحدیث کی ہدایات وتعلیمات کو پس پشت ڈال کر اپنے جینے اور رہنے کے نئے نئے زاویے مقرر کر لیے ہیں، جس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ معاشرہ بدچلنی، بدامنی اور بدکرداری کی آخری حدوں کو چھو رہا ہے، جب معاملات اور معاشرت میں بظاہر چھوٹی چھوٹی دکھائی دینے والی باتوں اور امور کا خیال نہیں رکھا جائے گا تو یقیناً انسانیت مبتلائے کرب واذیت ہوگی، پھر ایک انسان سے دوسرا انسان غیر محفوظ رہے گا، ہر شخص ذاتی، شخصی اور انفرادی حیثیت جتانے کی کوشش میں لگا رہے گا، اپنے حق کو وصول کرنے کے دوسرے کے حقوق پامال کیے جاتے رہیں گے، زبانیں دوسروں کے دلوں کو چیرتی رہیں گی، ہاتھ غیروں کے گریبانوں کو چاک کرتے رہیں گے، انسانی زندگی پانی کی طرح سستی اور بے قیمت ہوکر رہ جائے گی، جھوٹ، خیانت، وعدہ خلافی اور بدزبانی عام ہوتی چلی جائے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ زبان کا درست استعمال، لایعنی گفتگو سے اجتناب اور بدگوئی سے پرہیز آدمی کو مذکورہ تباہیوں اور ہلاکتوں سے بچا سکتا ہے، وہ تمام نفرتیں، کدورتیں اور ناچاقیاں جو زبان کے غلط اور نازیبا استعمال سے پیدا ہوتی ہیں، اس کی درستگی سے دور کی جا سکتی ہیں، محبت والفت، بھائی چارہ اور احساس باہمی کے جذبات وخیالات کو فروغ مل سکتا ہے، شیطانی اقوال کی جگہ پاکیزہ الفاظ، رب کی رحمت ورضوان کا پروانہ بن سکتے ہیں، نفاق کی قلبی بیماری کو روحانی دوا مل سکتی ہے، انسان طاغوت کے راستے پر چلنے سے بچ سکتا ہے، ضرورت ہے صرف حوصلہ، ہمت اور فکری بیداری کی۔

ادیان و مذاہب

بدھ مذہب- حقائق ومعارف

(دو اہم تحقیقی کاموں کا تعارف)

طلحہ نعمت ندوی (پٹنہ)

گوتم بدھ اور بدھ مذہب سے متعلق مسلمانوں کی تاریخ میں بہت کم مواد ملتا ہے ہندو مذہب کے مطالعہ پر جتنی توجہ دی گئی بدھ مت کے مطالعہ کی طرف مسلمانوں کی علمی روایت میں وہ توجہ نہیں نظر آتی، ملل ونحل اور فرق وادیان کی کتابوں میں ان پر خاطر خواہ مواد نہیں ملتا، ابن الندیم نے الفہرست میں مذاہب السمنیہ کے نام سے ان کا تھوڑا سا ذکر کیا ہے، یہ لفظ اس وقت عام طور پر گوتم بدھ کے متبعین اور پیروکاروں کے لئے رائج تھا، ابن الندیم کو ایک اور کتاب ملل الھند وادیانھا کے عنوان سے ملی تھی جس میں لکھا تھا کہ یہ کتاب خالد برمکی کے حکم سے لکھی گئی ہے، لیکن اس میں البد کا جو تذکرہ ہے اس سے بت مراد ہے بدھ مذہب یا گوتم بدھ کا کہیں ذکر نہیں، بس سمنیہ کے ذیل میں یہ جملہ آیا ہے کہ ان کا نبی بوذاسف ہے، اس کے بعد الکلام علی البد کے عنوان سے لفظ بد کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ کچھ لوگوں کے بقول وہ حضرت باری جل وعلا کی تصویر ہے، اور کچھ کے بقول رسول کی، اس کے بعد جو تفصیلات ہیں وہ بدھ مذہب کے بجائے ہندو مذہب کے متعلق ہیں۔

(الفہرست جلد دوم/ ۴۲۲)

البیرونی جو تقریباً اسی زمانہ میں ہندوستان آیا تھا، وہ بھی بدھ مذہب سے متعلق کوئی قابل ذکر اطلاع فراہم نہیں کرتا، صرف سمنیہ کے نام سے ان کا اجمالی ذکر کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ ان کی بڑی تعداد فی الحال بلخ (موجودہ افغانستان) اور اس کے اطراف میں ہے، اس کے علاوہ اس کی ساری توجہ برہمنیت، اور سنسکرت میں موجود مواد اور ہندوؤں کے حالات کی تشریح پر مرکوز ہے، اس کے بعد ہندوستان سے تقریبا بدھ مذہب کا خاتمہ ہی ہوگیا تھا، چنانچہ عہد وسطی اور اس ملک میں مسلمانوں کے طویل دور حکومت میں بدھ مذہب اور گوتم بدھ کا تذکرہ نہیں ملتا، فارسی میں جن سنسکرت ادبیات وکتب مذاہب کے ترجمے ہوئے ان میں بدھ مذہب کی کسی کتاب کا ذکر نہیں آتا، بعض تمثیلی قصوں اور داستانوں میں گوتم بدھ کا ذکر آیا بھی ہے تو اس کو ایک برہمن زادہ کی صورت میں پیش کیا گیا ہے، برہمنوں کی یہی سازش تھی، کہ اس ملک سے بدھ مذہب کا خاتمہ کردیا جائے، اور ان کے اہم واقعات کو اپنی طرف منسوب کردیا جائے، چنانچہ عہد وسطی میں ایسا ہی نظر آتا ہے۔ حالاں کہ یہ سچ ہے کہ ہندوستان میں اولین دور میں اسلام لانے والے ویدک مذہب سے زیادہ بدھ مذہب کے متبعین تھے، اور ان کو اسلام اپنے مذہب سے زیادہ قریب نظر آیا، اور مولانا مناظر احسن گیلانی نے اس پر سوال قائم کیا ہے کہ آخر وہ کیا چیز تھی، جس نے ان کو اسلام کو اس قدر جلد از جلد قبول کرنے کی طرف مائل کیا، یہ تحقیق کا موضوع ہے، اور یہ سچ ہے کہ موجودہ افغانستان کا بڑا حصہ اسی مذہب کے ماننے والوں سے آباد تھا جو بہت جلد اور آسانی کے ساتھ مکمل اسلام میں داخل ہوگیا، اس کی مثال اور دوسری جگہ کم ملے گی۔

انگریزوں کی آمد کے بعد جب اس ملک کی تاریخ کو پھر نئی زندگی ملی، چینی سیاحوں کے سفرناموں میں محفوظ کردہ معلومات کے تراجم سے نئی اطلاعات سامنے آئیں، زیر زمین کھدائی سے بہت سی معلومات حاصل ہوئیں، پھر چین میں موجود اس مذہب کی مذہبی کتابیں کتابیں یہاں برآمد کی گئیں، تو یہ مذہب یہاں دوبارہ متعارف ہوا۔

لیکن اہل یورپ نے جو تحقیقات پیش کیں ان کی رو سے گوتم بدھ کی تعلیمات میں کہیں توحید کا تصور نہیں نظر آتا ہے، لیکن کچھ علمائے اسلام اس کے قائل تھے کہ اس کے یہاں صرف توحید کا تصور ہی نہیں بلکہ اعلی تصور موجود ہے، اور وہ ایک مصلح تھا، اس سلسلہ میں مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کا نام سب سے اہم ہے، جنہوں نے یقین کی حد تک یہ رائے پیش کی اور اپنی تحریروں میں جابجا اسے نبی ثابت کرنے کی کوشش کی، گوتم بدھ اور بدھ مذہب سے متعلق ان کے تصورات مستقل مطالعہ کا موضوع ہیں۔ ان کی ایک رائے اوپر گذر چکی، نیز انہوں نے النبی الخاتم میں ایک اخبار کے حوالہ سے لکھا ہے کہ بدھا نے مرتے وقت اپنے پیروؤں کو نصیحت کی تھی کہ میرے بعد ایک شخص آئے گا، جو رحمۃ للعالمین ہوگا، اس میں ''متریا'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی رحمت کے ہیں، اور یہ بھی لکھا ہے کہ میں بدھا کو حضور پاک علیہ السلام کا مشرقی نقیب اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مغربی نقیب سمجھتا ہوں۔ انہوں نے اسی کتاب میں گوتم بدھ سے متعلق اپنی وہ رائے بھی پیش کی ہے جو بہت مشہور ہے کہ لفظ ذوالکفل قرآن پاک میں ایک نبی کا نام بتایا گیا ہے، اس کے بارے میں مفسرین کی رائے میں بہت اختلاف ہے، اس لئے ایک اور رائے کا اضافہ کیا جاسکتا ہے کہ کفل لفظ کپل کا معرب ہو جو

گوتم بدھ کے مولد کپل وستو کا مخفف ہو اور ذو عربی میں والا کے معنی میں مستعمل ہے، اس طرح کپل وستو والا یعنی گوتم بدھ کی طرف اس نام سے اشارہ کیا گیا ہو۔ پھر انہوں نے ایک مستقل مضمون بھی لکھا جس میں قدیم عربی کتب تاریخ کے ذریعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ صابئین شاید گوتم بدھ کے ماننے والوں کا لقب تھا، اس کا امکان نظر آتا ہے، عام طور پر مولانا کی ان آراء کو وہ مقبولیت نہیں ملی لیکن ان کے دلائل غور وتفکر کی دعوت ضرور دیتے ہیں۔

ابھی حال ہی میں ایک ممتاز فاضل اور دیندار مسلم اسکالر جناب انجم فراز صاحب علیگ نے گوتم بدھ کو اپنی تحقیقات کا موضوع بنایا اور کئی سال کی تحقیق و مطالعہ کے بعد علمی دنیا کے سامنے انگریزی میں اپنا حاصل مطالعہ وتحقیق پیش کیا، چنانچہ انہوں نے انگریزی میں دو کتابیں لکھیں، اول الذکر کا عنوان ہے گوتم بدھ ملحد یا موحد، LORD BUDDHA ATHIEST OR BELIVER?

موصوف نے اس میں خود گوتم بدھ کی تعلیمات کی روشنی میں یہ دکھایا ہے کہ وہ ملحد نہیں موحد تھے، ان کی تمام تعلیمات توحید ہی کے اردگرد گردش کرتی ہیں، خود وہ ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو مذہب کو مانتا تھا، تو یہ کیوں کر ممکن تھا کہ وہ ملحد ہوجاتے، خاص طور پر اس لئے بھی کہ وقت مذہب بیزاری کا تصور عام نہیں تھا، انہوں نے قدیم ہندوستانی لٹریچر کا عالمانہ جائزہ لیا ہے، اور بدھ اور ویدک قدیم ماخذ کی طویل طویل عبارتیں نقل کی ہیں، اور دکھایا ہے کہ گرچہ اس دور میں چند فلاسفہ ہند کے یہاں الحاد کا تصور تھا اور کچھ غیر مذہبی تصورات بھی تھے، لیکن گوتم بدھ کا لٹریچر اس طرح کے تصورات سے خالی ہے۔ پھر انہوں نے گوتم بدھ کی ریاضت وخلوت اور حضور پاک علیہ السلام کی غار حرا میں خلوت میں مشابہت کا ذکر کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ یہ تصور عام طور پر انبیاء کے یہاں پایا جاتا ہے، اور اسلام اور گوتم بدھ کی تعلیمات میں دونوں طرف کی مذہبی کتابوں کے اقتباسات کے ذریعہ یکسانیت دکھائی ہے، پھر انہوں نے athiest denied کا عنوان قائم کرکے بتایا ہے کہ ان کے یہاں لادینیت کی سخت تردید ملتی ہے، مصنف کے بقول عام طور پر بودھا کے بارے میں مشہور ہے کہ اس نے ویدوں پر تنقید کی تھی لیکن بدھ مذہب کے دستیاب لٹریچر اور کتبات میں کوئی ایسی بات نہیں جس سے اس مفروضہ کی توثیق ہو، بلکہ ان کے بعض شاگرد برہمن تھے، اور مذہب کے پابند، ہاں وہ برہمنوں کے استحصالی مزاج ونظام کے سخت مخالف تھے۔ پھر انہوں نے سانکھی فلسفہ اور جاتکا کہانیوں کے ذریعہ بھی اس کے نظریہ مذہب وتوحید کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، اور نصوص اسلامی کے ذریعہ جابجا ان کی تعلیمات کی تصویب بھی ہے۔ اور اخیر میں برآمد شدہ کتبات، اور اشوک اعظم کے ستونوں اور کتبات میں کندہ تعلیمات کے ذریعہ بھی اس کو ثابت کیا ہے، اور بتایا ہے کہ کہیں بھی مذہب بیزاری کی کوئی تعلیم نہیں نظر آتی، پھر چند عناوین کے ذریعہ گوتم بدھ کے تصور جہنم اور تردید کفر کی بھی وضاحت کی گئی ہے۔

لہٰذا انگریزوں کی یہ تحقیق درست نہیں کہ گوتم بدھ ایک سماجی مصلح تھے، مذہبی نہیں تھے۔ انہیں کی تحقیقات پر اعتماد کرکے موجودہ دور کی عربی کتابوں میں بھی یہی تصور پیش کیا گیا ہے، چنانچہ حال میں عالم عربی میں ادیان ومذاہب پر جو کتابیں منظر عام پر آئی ہیں ان میں بیشتر اہل یورپ کے مصادر پر ہی مبنی ہیں، چنانچہ ان میں بھی عام طور پر گوتم بدھ کو ملحد اور مذہب بیزار قرار دیا گیا ہے۔

انجم فراز صاحب کی یہ کتاب نسبتاً مختصر ہے، ۲۰۰ صفحات میں مکمل ہوگئی ہے، انہوں نے اس میں انگریزی ماخذ وتراجم کے ساتھ ہندی مصادر سے بھی مکمل استفادہ کیا ہے۔

اس موضوع پر فراز صاحب کی دوسری کتاب MAITRYA کے عنوان سے ہے، جو انگریزی میں ضخیم اور تحقیقی کتاب ہے، اور ساڑھے پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے، متریا کا لفظ رحمت کے معنی میں ہے، یہ لفظ موت کے وقت گوتم بدھ کی زبان سے نکلا تھا جس کی تفصیل مولانا گیلانی کے حوالہ سے گذر چکی ہے۔

مصنف نے اس کتاب میں یہی ثابت کیا ہے کہ اس لفظ کا حقیقی مصداق رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی ہے، اور یہ پوری بحث اسی کی تفصیل وتوضیح ہے، چنانچہ نبوت کی حقیقت، مختلف اقوام کے انبیاء، آخری نبی سے متعلق ان صحائف کی بشارتوں کا ذکر کرتے ہوئے گوتم بدھ کی نبوت، قرآن پاک کے لفظ ذوالکفل کا ان پر انطباق اور توحید کے متعلق ان کی تعلیم اور حضور پاک علیہ السلام کے متعلق ان کی بشارت کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اسی ضمن میں برہمنیت کے استحصال اور بدھ مت کے زوال اور دوسرے ممالک میں اس مذہب کے فروغ کا بھی تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ الغرض یہ کتاب بھی مصنف کے سالوں کے مطالعہ اور تحقیق کا حاصل ہے، دونوں کتابیں مسلمانوں میں مطالعہ مذاہب کی روایت کو فروغ دینے کے ساتھ بدھ مذہب کے متبعین کو اسلام کے تئیں غور وفکر کی دعوت دیتی ہیں، اور انہیں اس سے قریب کرتی ہیں۔

دینِ حق

اسلام میں پاپائیت نہیں!

محمد نفیس خان ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

پاپائیت وہ نظامِ زندگی ہے جس میں انسان کے تمام روحانی اور مذہبی اختیارات کسی پوپ (اعلیٰ مذہبی رہنما) کے قبضے میں ہوتے ہیں۔ اس تصور کے تحت، ایک عام انسان نہ براہِ راست اپنے رب سے تعلق قائم کرسکتا ہے اور نہ اس کے احکام کو سمجھ سکتا ہے، بلکہ اس کی عبادات، اس کی دعائیں اور اس کے گناہوں کی معافی سب پوپ کی مرضی یا سفارش سے مشروط ہوتی ہیں۔

پاپائیت کا نظام مذہبی تاریخ میں ایک مخصوص ارتقا کے نتیجے میں ابھرا، جس کی جڑیں یونان وروم کی تاریخی اور معاشرتی ترقیات سے وابستہ ہیں۔ اس دور میں مذہب اور سیاست دو الگ دھارے نہ تھے بلکہ ایک ہی حقیقت کے دو پہلو سمجھے جاتے تھے۔ ان کے اپنے عقائد ورسوم تھے، ایک مخصوص فلسفۂ حیات تھا جس کے ذریعے فرد ومعاشرہ کی فلاح وبہبود کا سامان فراہم کیا جاتا تھا، مذہب اور سیاست دونوں کو عوام کی اصلاح، ان کی خوشحالی اور ترقی کے لیے لازم وملزوم سمجھا جاتا تھا۔

مگر جب مسیحیت نے رومی سلطنت میں قدم رکھا تو اس نے اس ہم آہنگی اور یگانگت کی بنیادیں متزلزل کردیں جو صدیوں تک مذہب وسیاست کو باہم جوڑے ہوئے تھیں۔ اس کے نتیجے میں ایک نیا نظریہ پروان چڑھا جس نے دین اور دنیا کے دائروں کو علیحدہ کردیا۔ اس تفریق نے ''قیصر اور خدا کے حقوق'' کے درمیان ایک واضح خطِ فاصل کھینچ دی۔ چنانچہ مذہب اور ریاست دو متوازی قوتوں کی صورت اختیار کر گئے، جن میں سے ہر ایک اپنے اپنے دائرۂ اختیار میں مطلق العنان بن بیٹھا۔ ریاست کو امن وامان، نظم وضبط اور مادی خوشحالی کی ضمانت سمجھا گیا، جبکہ کلیسا نے روحانی نجات، اخلاقی نگرانی اور اخروی فلاح کے ضامن کے طور پر اپنے اختیارات مضبوط کرلیے۔ اس نئے نظام میں قیصر (بادشاہ یا سیاسی حکمران) ریاستی نظم کا ذمہ دار ٹھہرا، اور پوپ (کلیسا کا سربراہ) مذہبی وروحانی معاملات کا محور قرار پایا، جو خدا اور بندے کے درمیان اعلیٰ ثالث اور واسطہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس طرح مغربی دنیا میں کلیسا اور سلطنت کے درمیان ایک ایسا دوہرا ڈھانچہ وجود میں آیا جس نے قرونِ وسطیٰ کے پورے سیاسی و مذہبی منظر نامے کو تشکیل دیا۔

پوپ کی حیثیت نہ صرف ایک مذہبی پیشوا کی تھی بلکہ اسے سیاہ وسفید کا مالک، قانون وشریعت کی تعبیر وتاویل کا مختارِ کل اور حلال وحرام کی سرحدوں کا تعین کرنے والا سمجھا جاتا تھا۔ اس کے حکم کے مقابلہ میں شاہی فرمان کی بھی کوئی وقعت نہ تھی۔ گنہگاروں، خاص طور پر اہلِ ثروت کے لیے مغفرت کا پروانہ اسی کے در سے حاصل ہوتا، اور اعترافِ گناہ (Confession) کے نام پر کلیساؤں میں انسانی کمزوریوں اور معصیتوں کو نقد، جنس یا دیگر وسائل کی صورت میں خریدا اور بیچا جاتا۔

اعترافِ گناہ کا یہ نظام دراصل عوامی ذہنیت کو قابو میں رکھنے اور انہیں نظام پاپائیت کے تحت مشروط کرنے کا ایک مؤثر حربہ تھا۔ ہر فرد پر لازم تھا کہ وہ اپنے گناہوں کا اعتراف پادری یا مذہبی رہنما کے سامنے کرے۔ جس کے نتیجہ میں عام لوگ سخت سزاؤں اور تادیبی اقدامات سے دوچار ہوتے، جبکہ امیر وصاحبِ حیثیت افراد مالی نذرانوں یا دیگر مراعات کے بدلے بخشش نامے حاصل کرکے اپنے گناہوں سے سبک دوش ہوجاتے تھے۔

پوپ کی حکم عدولی ایک ایسا سنگین جرم تصور کیا جاتا تھا جس کی سزا صرف موت نہیں بلکہ انتہائی اذیت ناک اور رُوح فرسا موت تھی۔ اس جرم کے خلاف کارروائی کے لیے پوپ نے ایک مستقل ادارہ قائم کیا، جسے ''محکمہ تفتیش'' (Inquisition) کہا جاتا تھا۔ اس محکمہ کے شکنجے میں آنے والا ہر شخص نہ صرف قانونی طور پر بلکہ جسمانی اور ذہنی طور پر بھی شدید اذیتوں کا شکار ہوتا۔ گرفتار افراد کو اکثر قید وبند کی اذیت، فاقہ کشی اور جسمانی شکنجوں میں مبتلا کیا جاتا، حتیٰ کہ بعض اوقات انہیں جرم کا اعتراف کرنے سے قبل ہی ہلاک کردیا جاتا۔

تاریخی دستاویزات اور اعداد وشمار کے مطابق پوپ کی مخالفت کرنے والوں کے خلاف اس جبر وتشدد کے نتیجے میں تقریباً پچاس لاکھ افراد کو موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ صرف اٹھارہ برس کے مختصر عرصے (1481ء تا 1499ء) میں محکمۂ تفتیش کے احکامات کے تحت ہزاروں افراد کو زندہ جلایا گیا، سینکڑوں کے اعضا ٹکڑے ٹکڑے کیے گئے، اور لاکھوں افراد کو آہنی شکنجوں میں کس کر موت کے حوالے کیا گیا۔ اس ظالمانہ نظام نے نہ صرف عوام کی آزادی اور ذہنی خودمختاری کو دبادیا بلکہ انسانی زندگی اور حقوق کو بھی مکمل طور پر پوپ اور کلیسا کے اختیار میں محدود کر

دیا۔عوام کے لیے خوف اور دہشت کا یہ ماحول اتنا شدید تھا کہ عام انسان کے لیے پوپ کی مرضی کے بغیر کوئی فیصلہ یا عمل کرنا تقریباً ناممکن تھا۔اس طرح پوپ کی مطلق العنان طاقت نے معاشرتی اور روحانی زندگی کے ہر پہلو کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیا۔

اگرچہ آج پاپائیت کی گرفت ماضی جیسی نہیں رہی، لیکن مذہبی استبداد اور اخلاقی استحصال کی صورتیں کسی نہ کسی شکل میں اب بھی باقی ہیں۔

یہی صورت حال ہندو سماج میں بھی نظر آتی ہے، جہاں مندروں کے پجاری اور مٹھوں کے سوامی نیم خدائی مقام رکھتے ہیں، عوام کی ایک بڑی تعداد یہ عقیدہ رکھتی ہے کہ ان کی مرضی اور دعا کے بغیر نہ مصیبت ٹل سکتی ہے، نہ اولاد پیدا ہوسکتی ہے اور دنیا کی دوسری ضروریات پوری ہوسکتی ہیں، اسی عقیدہ کے سہارے مذہبی اور سماجی اقتدار کے غلط استعمال کے واقعات عام ہیں، جن میں اخلاق سوز حرکات، مالی استحصال، اور عوامی خدشات کا ناجائز فائدہ اٹھانا شامل ہے۔

المیہ یہ ہے کہ بعض سادہ لوح مسلمان بھی اسی طرزِ فکر کو اسلام پر منطبق کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ مفتیانِ کرام اور علمائے عظام کو ایسے دیکھتے ہیں گویا وہ شریعت سازی کے مجاز ہوں، ان کے ذہن کے کسی نہ کسی گوشے میں یہ تصور بیٹھا ہوا ہے کہ مفتی یا عالم کسی بھی اسلامی حکم کو اپنی مرضی کے مطابق حلال یا حرام، جائز یا ناجائز قرار دے سکتا ہے اور حسبِ خواہش یا حسبِ فرمائش اسلامی احکام میں ردّوبدل کرسکتا ہے۔

یہ غلط فہمی اس وجہ سے بھی پیدا ہوتی ہے کہ تاریخ میں بعض ادوار میں مخصوص علما اور سلاطین نے باہمی مفادات کے تحت دین کو اپنے سیاسی یا معاشرتی مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ اس سے عوام کے ذہن میں یہ تاثر پیدا ہوگیا کہ گویا علماء کو ایسا ہی اختیار حاصل ہے جیسا عیسائیت میں پوپ کو تھا یا ہندو سماج میں پجاری اور سوامی کو ہے۔ نتیجتاً عوام اپنے مسائل کے حل کے لیے براہِ راست قرآن وسنت کی طرف رجوع کرنے کے بجائے شخصیت پرستی میں مبتلا ہوجاتے ہیں اور یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اگر فلاں مفتی یا عالم نے اجازت دے دی تو خدا کی طرف سے بھی وہی حکم نافذ ہو جائے گا۔حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں قانون سازی کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے: إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ (حکم دینا (قانون بنانا) اللہ کے سوا کسی کا حق نہیں ہے)۔

علماء کرام اور مفتیانِ عظام کا منصب صرف یہ ہے کہ وہ قرآن وسنت، اجماع اور فقہی اصولوں کی روشنی میں شرعی احکام کو سمجھیں اور موجودہ حالات پر ان کا اطلاق کریں۔ ان کی رائے یا فتویٰ بذاتِ خود شریعت نہیں، بلکہ شریعت کے فہم کی ایک کوشش ہے، اگر وہ درست استدلال کریں تو ثواب کے مستحق ہیں، اور اگر غلطی کریں تو ان کا قول حجتِ قطعی نہیں رہتا، اسی لیے امت میں ہمیشہ مختلف آراء اور اجتہادات پائے گئے ہیں، لیکن کسی ایک عالم یا مفتی کو یہ مقام نہیں دیا گیا کہ وہ قطعی اور حرفِ آخر قرار پائے۔

اسلام کا اصل امتیاز یہ ہے کہ اس نے بندے اور رب کے درمیان کسی کو ثالثی (clergy) مقرر نہیں کیا۔ مسلمان براہِ راست قرآن کی تلاوت کر سکتا ہے، دعا میں اللہ سے ہم کلام ہوسکتا ہے، اور شریعت کے بنیادی احکام کو بلا واسطہ سمجھ سکتا ہے۔

اسلام نے نہ کسی کو خدا اور بندے کے درمیان واسطہ بنایا ہے، نہ ہی کسی مخصوص مذہبی منصب، عالم یا روحانی پیشوا کو مطلق العنان حیثیت دی ہے۔کوئی بڑا سے بڑا عالم، مفتی یا روحانی رہنما یہ اختیار نہیں رکھتا کہ مذہبی معاملات میں اپنی مرضی نافذ کرے یا اپنی منشاء کے مطابق اسلامی احکام میں ردّ و بدل کرے۔ علماء کا کردار صرف رہنمائی اور وضاحت ہے، نہ کہ تقدیس اور اقتدار۔ اگر یہ فرق مٹ جائے تو اسلام بھی پاپائیت یا ہندو پجاریانہ نظام کی طرح ایک جامد اور ظالمانہ ڈھانچہ میں بدل سکتا ہے، جو اسلام کی اصل روح کے خلاف ہے۔

اسلام میں گناہوں کے اعتراف یا روحانی رہنمائی کے لیے کسی پادری، بزرگ یا پیشوا کی چوکھٹ پر جانے کی ضرورت نہیں، ہر انسان کو براہِ راست اللہ سے رجوع کرنے اور اپنے اعمال کا حساب صرف اسی کے سامنے دینے کا حق حاصل ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے: {وَهُوَ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ} (اور وہ انسان کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہے)۔

یہی وہ امتیاز ہے جو اسلام کو دیگر مذاہب اور نظاموں سے جدا کرتا ہے۔ اسلام نے انسان کو براہِ راست اپنے خالق سے جوڑ کر اسے روحانی غلامی، پجاریانہ تسلط اور شخصیت پرستی کی زنجیروں سے آزاد کر دیا۔ یہاں نہ کسی پوپ کا ڈنکا بجتا ہے، نہ کسی سوامی یا پجاری کا حکم چلتا ہے، اور نہ ہی کسی عالم یا رہنما کو مطلق العنانی روا ہوتی ہے۔ اسلام نے ہر فرد کو اس شعور اور ذمہ داری سے نوازا ہے کہ وہ براہِ راست اللہ کے حضور جواب دہ ہے، اور اس کا رشتہ اپنے رب سے کسی واسطہ یا ثالث کا محتاج نہیں۔

یہی براہِ راست تعلق انسان کو حقیقی آزادی، روحانی بالیدگی اور ایمانی وقار عطا کرتا ہے، اور یہی اسلام کی اصل روح اور اس کا سب سے بڑا آفاقی پیغام ہے۔

فقہ وفتاویٰ

تجاویز ساتواں فقہی سمینار

مجلس تحقیقات شرعیہ، ندوۃ العلماء

مورخہ: ۴-۵/ربیع الثانی ۱۴۴۷ھ- مطابق ۲۷-۲۸/ستمبر ۲۰۲۵ء کو مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء کا ساتواں دوروزہ فقہی سیمینار دارالعلوم ندوۃ العلماء کے علامہ حیدر حسن خاں ٹونکی ہال میں منعقد ہوا، جس میں پورے ملک سے بڑی تعداد میں علماء اور اصحاب افتاء نے شرکت کی اور غور وخوض اور تبادلہ خیالات کے بعد درج ذیل تین موضوعات پر اتفاق رائے سے تجاویز منظور ہوئیں۔

(۱) تجاویز بابت:

مساجد اور ان کے اوقاف سے متعلق چند مسائل

۱۔ جو مسجدیں نمازیوں کی کثرت کی وجہ سے تنگ ہو رہی ہوں، توسیع کی غرض سے ان کو شہید کر کے کئی منزلیں بنائی جا سکتی ہیں، اور بر بنائے ضرورت کسی منزل کو دینی تعلیم کے لیے استعمال کرنا درست ہے، البتہ اس کی کسی منزل کو طلبہ کی رہائش کے لیے مستقل طور پر استعمال کرنا یا اس کے کسی حصہ کو کرایہ پر دینا درست نہیں ہے، کیونکہ یہ مسجد کے بنیادی مقاصد اور اس کے تقدس کے خلاف ہے۔

۲۔ اگر کسی اپارٹمنٹ میں کوئی منزل خرید کر یا کثیر منزلہ عمارت تعمیر کرتے وقت کسی منزل کو بطور مسجد وقف کر دیا جائے، تو یہ منزل مسجد شرعی کے حکم میں ہوگی، بشرطیکہ اس میں عام لوگوں کو نماز پڑھنے کی اجازت ہو۔

۳۔ وہ زرعی زمین جو مسجد پر وقف ہو، اگر وہ قابل انتفاع نہ ہو یا اتنی کم منفعت ہو کہ اس سے ضروریات مسجد پوری نہ ہوتی ہوں تو یہ جائز ہے کہ اس زمین کے بدلے ایسی زمین یا دکان حاصل کر لی جائے جس کی آمدنی سے ضروریات مسجد پوری کی جا سکیں، اگر یہ اندیشہ ہو کہ اس زمین کو بدلنے میں وقف کا ضیاع ہوگا تو پھر ایسا کرنا جائز نہ ہوگا۔

۴۔ مسجد کی انتظامیہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ مسجد سے الگ امام اور موذن کی رہائش کا انتظام کرے، البتہ ضرورت کے وقت عارضی طور پر امام وموذن کے لئے مسجد کے کسی حصہ میں قیام کی گنجائش ہے۔

۵۔ قدیم مسجد کے آس پاس کی وہ زمینیں جو موقوفہ مسجد شرعی میں شامل نہیں ہیں بلکہ مصالح مسجد کے لئے ہیں وہاں نمازیوں کے لئے پارکنگ کی تعمیر کرنا، مسجد کے ائمہ، موذنین اور خدام کے لئے رہائش گاہ (فیملی کوارٹر) کا بندوبست کرنا یا دوسرے ایسے کام کرنا جو مصالح مسجد میں شامل ہو، درست ہے۔

۶۔ نئی مساجد کی تعمیر کے وقت اگر مسجد کے لئے زمین وقف کرنے والا شخص یا اشخاص اس طرح تعمیری منصوبہ بناتے ہیں کہ بیسمنٹ میں پارکنگ ہو، اوپر کی منزلیں مسجد کے لئے ہوں یا کوئی منزل دینی تعلیم کے لئے ہو تو شرعاً اس کی گنجائش ہے۔

(۲) تجاویز بابت:

قبرستان کے چند جدید مسائل

۱۔ جن قبرستانوں میں پہلے سے بنی ہوئی مسجد میں وضوخانہ نہ ہو، وہاں ایسی جگہ وضوخانہ اور استنجاء خانہ بنایا جا سکتا ہے، جہاں قبریں موجود نہ ہوں۔

۲۔ اگر قبرستان وسیع ہو تو ضرورت کے وقت خالی جگہ میں مسجد، وضوخانہ اور استنجاء خانہ بنانے کی گنجائش ہے، لیکن قبرستان تنگ ہو تو تعمیر مسجد کی گنجائش نہیں ہے، کیونکہ یہ مقصد وقف کے خلاف ہے۔

۳۔ تحفظ قبرستان کے پیش نظر وسیع قبرستان کی خالی جگہ کو عارضی طور پر تعلیم یا کسی اور جائز مقصد کے لیے کرائے پر دیا جا سکتا ہے، لیکن معاہدہ میں یہ صراحت ضروری ہے کہ یہ قبرستان کی زمین ہے اور آئندہ تدفین کے لیے ضرورت پڑنے پر اس کو واپس کرنا لازم ہوگا۔

۴۔ قبرستان کی خالی جگہ میں جنازہ گاہ بنانا جائز ہے، بشرطیکہ سامنے قبر نہ ہو یا ہو تو کوئی حائل (آڑ) موجود ہو۔

۵۔ عام حالات میں قبرستان کو کھلیان، اور باڑہ وغیرہ کے طور پر استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔

(۳) تجاویز بابت:

"تلفیق بین المذاہب اور تتبع رخص"

اہل سنت کے تمام فقہی مسالک جو دنیا کے مختلف ممالک اور علاقوں میں مروج ہیں اور جن کی تقلید کی جاتی ہے، یہ سب اسلامی شریعت کا حصہ ہیں، اجتہادی مسائل میں ان کے اختلافات کی نوعیت حق و باطل کی نہیں ہے، بلکہ یہ سب کتاب وسنت کے سمندر سے نکلنے والی بافیض نہریں ہیں، جن سے امت مسلمہ سیراب ہو رہی ہے، اس لیے تمام فقہی مسالک کی کتابیں اور ان کے اجتہادات فقہ اسلامی کا گراں قدر حصہ ہیں۔

جو علماء اور اصحاب افتاء عام فقہی اجتہادی مسائل میں کسی خاص فقہی مسلک کی پابندی کرتے ہیں، جب انہیں بعض مسائل میں موجودہ حالات کے تحت اپنے مسلک کی اجتہادی رائے پر عمل کرنے یا اس پر فتوی دینے میں شدید حرج محسوس

ہوتا ہے اور وہ ضرورت سمجھتے ہیں کہ کسی دوسرے فقہی مسلک کی اجتہادی رائے کو اختیار کر کے اس دشواری کا حل تلاش کریں اور امت مسلمہ کے لیے یسر وسہولت پیدا کریں، تو ان کے لیے یہ بات رکاوٹ بنتی ہے کہ کہیں ایسا کرنے میں ممنوع تلفیق بین المذاہب لازم نہ آئے، اس پس منظر میں بحث وتمحیص کے بعد درج ذیل تجاویز منظور کی گئیں:

۱۔ تلفیق سے مراد ایک ہی عمل میں دو یا دو سے زائد فقہاء کی رائے کو اس طرح جمع کرنا ہے کہ بحیثیت مجموعی وہ عمل ان میں سے کسی کے نزدیک بھی درست قرار نہ پاتا ہو، یہ شکل ناجائز ہے۔

۲۔ پیچیدہ مسائل کو حل کرنے اور امت سے حرج اور تنگی کو دور کرنے کے لیے درج ذیل شرائط کے ساتھ ظاہری تلفیق (جو درحقیقت دوسرے فقہی مسلک سے استفادہ ہے) کو اختیار کرنے کی اجازت ہے:

الف: تلفیق سے کسی نص یا اجماع کی مخالفت نہ ہوتی ہو۔

ب: تلفیق اتباع ہوئی کی غرض سے نہ ہو۔

ج: تلفیق کے نتیجہ میں کسی حرمت شرعیہ کا جواز لازم نہ آتا ہو۔

د: جس مسلک کے فقہی قول کو لیا جائے اس کی تمام شرائط کی رعایت کی جائے۔

۳۔ یہ تلفیق معتبر اصحاب افتاء کے اجتماعی غور وخوض کے ذریعہ انجام پائے، لیکن بوقت ضرورت انفرادی فتاوی میں بھی اس کی گنجائش ہے۔

۴۔ محض خواہش نفس کی بنیاد پر فقہاء کی سہولتوں کو اختیار کرنا درست نہیں ہے کہ یہ احکام شریعت سے آزاد ہونے کا ذریعہ ہے۔

۵۔ فقہاء کے آسان اقوال کو اختیار کرنا درج ذیل شرائط کے ساتھ درست ہے:

الف: وہ اقوال شرعاً غیر معتبر اور شاذ نہ ہوں۔

ب: مشقت کو دور کرنے کے لیے رخصت اختیار کرنے کی حاجت ہو۔

ج: رخصت کا مقصد کسی غیر مشروع عمل کی انجام دہی نہ ہو۔

❁❁❁

دعوت واصلاح کے لئے ناصحانہ وہمدردانہ طریقہ

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ

موجودہ حالات میں داعیانِ اسلام اور مصلحین کے لیے ضروری ہے کہ تجربات کی روشنی میں غور وخوض کریں، قرآن وسیرت میں ذکر کردہ طریقۂ دعوت واصلاح اور ماضی میں داعیانِ اسلام نے ظالم وجابر حکمرانوں کے سامنے دعوت کا کیا طریقہ اختیار کیا تھا' اس کا مطالعہ کریں، تاریخ میں بہت ساری مثالیں ایسے مفکرین اور مصلحین کی موجود ہیں جنہوں نے مذاکرات اور بات چیت کے ذریعہ حکام اور مصلحین کے درمیان آپسی ٹکراؤ وکشمکش کو ختم کیا اور ناصحانہ انداز میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیا، ان کے ناصحانہ اسلوب نے مخاطبین پر اچھا اثر ڈالا اور امید افزا نتائج برآمد ہوئے۔

موجودہ حالات میں اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ہم ناصحانہ اور ہمدردانہ طریقہ اپنائیں اور دعوتِ دین کے فریضہ کو حکمت ودور اندیشی سے انجام دیں، تعلیم یافتہ طبقہ، اسلامی ممالک کے حکمراں، فکری رہنمائی، تعلیم وتربیت اور ذرائع ابلاغ کے ذمہ داروں میں اسلام کی بے پناہ صلاحیت وقدرت کا اعتماد پیدا کریں، انسانی کارواں کو اعلیٰ اقدار اور زندگی کی کشتی کو امن وسلامتی اور خوش بختی کے ساحل پر لانے کی کوشش کریں۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ عالم عربی میں کی گئی ایک تقریر میں کہتے ہیں:

''دینی دعوت وتبلیغ اور اسلامی تجدید کا کام اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ سمجھ لیا گیا ہے، اس کا کام اور پیغام صرف اتنا نہیں ہے کہ ایک نظام کی جگہ دوسرا نظام، اور ایک سیاسی واقتصادی نظام کی جگہ دوسرا سیاسی واقتصادی نظام لایا جائے، نہ علم وثقافت کو عام کرنا، جہالت کو مٹانا، بے کاری وبے روزگاری کے خلاف جنگ چھیڑنا ہے اور نہ ہی معاشرتی واخلاقی خرابیوں کا علاج اس ڈھنگ سے کرنا ہے جس طرح یورپ کے مصلحین اور مغرب کے ریفارمر کیا کرتے ہیں، اس دعوت کا کام تو اس ''اسلام'' کی طرف بلانا ہے جو عقیدہ، عمل، اخلاق وکردار، عبادت وسیاست، انفرادی واجتماعی سلوک سب پر حاوی ہے، اس میں قلب، ذہن ودماغ اور جسم وروح شامل ہیں، کوئی چیز اس کے دائرۂ بحث سے خارج نہیں، اس دعوت میں دل، دماغ، اندازِ فکر، انسانی نفسیات، عقائد، ذہنیت سب کے اندر گہری تبدیلی لائی جاتی ہے، اس دعوت کا سرچشمہ قلب ہے، نہ کہ قرطاس وقلم اور تقریر کا اسٹیج، یہ وہ دعوت ہے جو امت پر نافذ ہونے سے پہلے داعی کے جسم پر نافذ اور اس کی پوری زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے''۔

❁❁❁

NADWATUL-ULAMA
PO. BOX 93, TAGORE MARG, LUCKNOW
226007 U. P. (INDIA)

ندوۃ العلماء
پوسٹ باکس ۹۳، ٹیگور مارگ، لکھنؤ
۲۲۶۰۰۷ یوپی (ہند)

باسمہٖ تعالیٰ

Date 10th October 2025

تاریخ ۱۰؍اکتوبر ۲۰۲۵ء

اہلِ خیر حضرات سے

اللہ تعالیٰ کا شکر و احسان ہے کہ حضرت ناظم صاحب ندوۃ العلماء مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی دامت برکاتہم کی سرپرستی میں ندوۃ العلماء اپنی علمی، دینی، تعلیمی و تربیتی خدمات انجام دے رہا ہے، اور ان بیش قیمت اصولوں کو سینے سے لگائے ہوئے ہے جن کے لیے ندوۃ العلماء کو قائم کیا گیا تھا، یعنی جدید زمانہ میں اسلام کی مؤثر اور صحیح ترجمانی، دین و دنیا کی جامعیت اور علم و روحانیت کے اجتماع کی کوشش، فتنۂ لادینیت اور ذہنی ارتداد کا مقابلہ، اسلام پر اعتماد اور اسلامی علوم کی برتری و امتیاز کا اعلان و اظہار، دینِ حق سے وفاداری اور شریعت پر استقامت۔

آپ سے ہماری درخواست ہے کہ وقت کی اس ضرورت اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کی افادیت کو سمجھتے ہوئے پوری فراخدلی، فیاضی اور ہمت سے کام لے کر ان تمام کاموں میں بھرپور تعاون و اعانت فرمائیں کہ ہندوستان میں دین کے قلعوں کی حفاظت کی اس سے بہتر کوئی سبیل اور اس سے زیادہ پائدار کوئی صدقہ جاریہ نہیں۔

لہٰذا آپ حضرات سے گزارش ہے کہ اپنے صدقات و عطیات چیک یا ڈرافٹ کے ذریعہ اور آن لائن ندوۃ العلماء کے مندرجہ ذیل اکاؤنٹ میں منتقل فرمائیں، ایسے نازک اور مشکل حالات میں ندوۃ العلماء کے ساتھ آپ کا تعاون نہایت اہمیت رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کی کاوشوں کو قبول فرمائے اور ان کو ہمارے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے، آمین۔

(مولانا ڈاکٹر) تقی الدین ندوی	(ڈاکٹر) محمد اسلم صدیقی	(مولانا ڈاکٹر) سعید الرحمٰن اعظمی ندوی	(مولانا) محمد عمار حسنی ندوی
معتمد تعلیم ندوۃ العلماء	معتمد مال ندوۃ العلماء	مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء	ناظر عام ندوۃ العلماء

NADWATUL ULAMA

عطیات **A/c No. 1086 3759 711**

تعمیرات **A/c No. 1086 3759 733**

زکوٰۃ **A/c No. 1086 3759 766**

IFSC CODE : SBIN0000125 - STATE BANK OF INDIA, MAIN BRANCH, LUCKNOW

ONLINE DONATION LINK

https://www.nadwa.in/donation/

نوٹ: چیک/ڈرافٹ پر صرف یہ لکھیں:

NADWATUL ULAMA

اور اس پتہ پر ارسال کریں:

Nizamat office, Nadwatul Ulama,
Tagore Marge, Lucknow - 226007 (U.P.)

معطیان کرام! براہ کرم اپنے عطیات ارسال کرنے کے بعد مندرجہ ذیل نمبر

+91-8736833376

پر مطلع فرمانے کی زحمت کریں، اس سے دفتری کاروائی میں سہولت ہوگی۔

فجزاکم اللہ خیر الجزاء

website : www.nadwa.in
Email : nizamat@nadwa.in

نوٹ: ندوۃ العلماء لکھنؤ کو دیا گیا تعاون سیکشن 80G انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۶۱ء کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہوگا